ہندوستان

میں

مسلم پرسنل لا

کا

مسئلہ

مولانا عتیق احمد بستوی

استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نئی دہلی

1/76A، مین بازار، اوکھلا گاؤں، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

فون: 26322991 فون فیکس:26314784

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب:	ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کا مسئلہ
مصنف:	مولانا عتیق احمد بستوی
صفحات:	۹۶
کمپوزنگ:	اے ون کمپوٹر، مکارم نگر، لکھنؤ
اشاعت اول:	مارچ ۲۰۱۰ء
قیمت:	۵۰/روپے
طباعت:	

ناشر

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نئی دہلی

فہرست

مقدمہ ازحضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم ۷

پیش لفظ ازمصنف ۱۱

(۱) اسلام کے عائلی قوانین کے بارے میں موجودہ عدالتی رویہ ۱۵-۲۸

ہندوستانی عدلیہ کا طرزِ عمل ۱۵

موجودہ عدالتی رویہ پر تشویش وفکرمندی ۱۷

عدلیہ غلط فیصلوں سے مبرّا نہیں ہوتی ۱۸

فیصلہ کی بنیاد معاشی اور معاشرتی حالات ۱۹

سماج میں مردوں کے غلبہ کا شکوہ ۲۱

کیا شادی سے عورت کی انفرادیت ختم ہوجاتی ہے؟ ۲۲

ازدواجی رشتوں کا عدم استحکام ۲۳

اسلام کا نقطۂ نظر ۲۴

کیا رشتہ ٹوٹنے کے ہر کیس میں شوہر ہی قصوروار ہوتا ہے؟ ۲۴

فیصلے کا تضاد ۲۶

(۲) سپریم کورٹ کا ایک فیصلہ اور یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی کوششیں ۲۹-۶۳

فیصلہ کا خلاصہ ۲۹

فیصلہ کا تجزیہ ۳۱

سپریم کورٹ کا فیصلہ اور نومسلموں کی مشکلات ۳۳

بنیادی حقوق کی پامالی ۳۵

یکساں سول کوڈ کے مسئلہ کا قانونی اور تاریخی جائزہ ۳۶

دفعہ ۴۴ دستور ہند میں کس طرح شامل ہوئی ۳۶

دستور کی دفعہ ۲۵ اور دفعہ ۴۴ میں تضاد ۳۸

شریعت ایکٹ کا پس منظر ۴۰

تحریک آزادی اور مسلم پرسنل لا ۴۲

دستورِ ہند اور مسلمان ۴۲

یکساں سول کوڈ کی تشکیل وتنفیذ کی کوشش ۴۳

مذہبی آزادی اور مذہبی عمل کی تشریح ۴۴

یکساں سول کوڈ اور مسلمان ۴۵

ہندو عائلی قوانین میں اصلاح کا مقصد ۴۶

چور دروازوں سے مسلم پرسنل لا میں مداخلت ۴۷

یکساں سول کوڈ اور بھاجپائی حکومتیں ۴۸

کیا صوبائی حکومتیں مسلم پرسنل لا میں مداخلت کرسکتی ہیں؟ ۴۸

جدوجہد کے چار میدان ۵۰

۱- دستوری اور قانونی جدوجہد ۵۰

دفعہ ۴۴ کی منسوخی کے لئے جدوجہد ۵۰

یکساں سول کوڈ اور اقلیتیں ۵۱

یکساں سول کوڈ اور قومی یک جہتی ۵۲

ایک ناگزیر عمل ۵۴

پرسنل لاز کو دستوری تحفظ دینے کا مطالبہ ۵۵

مجوزہ قوانین کا جائزہ ۵۶

۲-علمی اور فکری محاذ (اسلام کے عائلی قوانین کی برتری) ۵۷

تصویر کا دوسرا رخ ۵۸

اہم ترین ذمہ داری ۵۸

یورپین کلچر اور عائلی قوانین ۵۹

۳-اصلاح معاشرہ ۶۱

۴-اسلامی نظام عدل کا قیام ۶۲

(۳) مسلم پرسنل لا سے متعلق پارلیمنٹ سے منظور شدہ متفرق ایکٹ ۶۵-۹۶

۱-مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق ایکٹ ۱۹۳۷ء ۶۵-۷۰

۲-فسخ نکاح (خلع) ایکٹ ۱۹۳۹ء ۷۱-۷۷

۳-قاضی ایکٹ ۱۸۸۰ء ۷۸-۸۳

۴-مسلم خواتین (طلاق کی صورت میں حقوق کا تحفظ) ایکٹ ۱۹۸۶ء ۸۴-۹۳

۵-کچھی میمن ایکٹ ۱۹۳۸ء (۱۹۳۸ء کا دسواں ایکٹ) ۹۴-۹۶

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا

ایک اقتباس

اسلام کے احکام کوئی راز نہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی نہ ہو، چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں، اور مدرسوں کے اندر شب و روز لوگ ان کا درس دیتے ہیں، پس گورنمنٹ کو چاہئے کہ صرف اس بات کی جانچ کرے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام ایسے ہی ہیں یا نہیں؟ اگر ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر صرف دو ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہئیں۔ یا مسلمانوں کے لئے ان کے مذہب کو چھوڑ دے اور کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے ان کے مذہب میں مداخلت ہو، یا پھر اعلان کر دے کہ اس کو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پروا نہیں ہے۔ نہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ ان کے مذہب میں مداخلت نہ ہوگی۔

اس کے بعد مسلمانوں کے لئے نہایت آسان ہو جائے گا کہ اپنا وقت بے سود شور و فغاں میں ضائع نہ کریں اور برٹش گورنمنٹ اور اسلام ان دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنے لئے پسند کریں۔

(مسئلہ خلافت و جزیرہ عرب ص ۲۰۴-۲۰۵ طبع ثانی، تصنیف: مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين ، خاتم النبيين ، سيدنا محمد ، وعلى آله وصحبه وعلى من تبعهم بإحسان ودعا بدعوتهم إلى يوم الدين ، أما بعد :

مذہب اسلام انسانی زندگی کو مناسب اور صحت مندانہ عمل رکھنے والی زندگی بنانے کا جامع مذہب ہے، وہ اپنی جامعیت کے تحت زندگی کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے، اور ان پہلوؤں کو پروردگار عالم کی عطا کردہ ہدایات کا پابند بناتا ہے، اسلام کا لفظ اسی مفہوم پر مشتمل ہے، یہ اپنے کو حوالہ کردینے کا مفہوم ہے، یعنی اپنے کو اپنے پروردگار اللہ تعالیٰ کے حوالے کردینا جو کہ ساری کائنات کا خالق و مالک ہے، اور ساری مخلوقات کا رب واحد ہے، زندگی اسی کی دی ہوئی ہے، سب اس کے بندے ہیں، لہذا اسی کی بندگی کرنے کی ان پر ذمہ داری ہے۔ بندگی کی یہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے آسان رکھی ہے تاکہ انسان بسہولت اس کو انجام دے سکے۔ اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ ”دین پر عمل کرنا آسان

ہے“۔ اس کے احکام کو مشکل نہیں رکھا گیا ہے، لیکن ان پر عمل ضروری قرار دیا گیا ہے، اور اس پر جزا وسزا طے فرمائی ہے، لہذا سزا کے ڈر سے اور جزا کے شوق میں ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔

جو لوگ دین کے متعلق یہ باتیں نہیں جانتے وہ اسلام کے مذہبی احکام کو اسی طرح کے احکام سمجھ کر جو انسانی دستور ساز بناتے ہیں، ان میں وقت اور زمانہ کے لحاظ سے تغیر وتبدل کی بات کرتے ہیں، حالانکہ یہ احکامات خدائی احکامات ہونے کی بنا پر قابل تغیر وتبدل نہیں ہیں۔

اس ملک میں چونکہ مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں، اور اکثریت غیر مسلموں کی ہے، اور ملک نے جو راستہ سیکولرازم کا اختیار کیا ہے، اس کی رو سے یہاں کے باشندوں کو مذہب کے معاملے میں اپنے اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے کا اختیار ہے، یہ اختیار اسلام میں خدائی احکام کا پابند ہے، لہذا بعض آوازیں جو تغیر وتبدل کی اٹھتی ہیں، ناواقف لوگوں پر ان کا غلط اثر پڑ سکتا ہے کہ ان کو صحیح سمجھ کر حکومت ان کے رجحان کو قبول نہ کرلے، یا عدالت اس کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہ کردے، اس لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ قائم کیا گیا، جس میں اسلام کے ہر مسلک والوں کی نمائندگی ہے تاکہ تحفظ شریعت کے سلسلہ میں رائے متفقہ رہے، اور الحمدللہ اس کا فائدہ ہورہا ہے، لیکن موجودہ دور میں جدید تعلیم یافتہ لوگ زیادہ ہیں، جو عموماً دین کی باتیں وضاحت کے ساتھ نہیں جانتے، اس لئے کسی بات کی تشریح یا کسی کے خیال کی تردید مناسب دلائل کے ساتھ انجام دینا ہے، اس لئے شریعت اسلامی کے تحفظ کی فکر کرنے والے اہل علم وقتاً فوقتاً ایسے مضامین پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں جن سے شریعت کی اہمیت کا اظہار ہو اور اعتراضات کا صحیح فکر کے مطابق نہ ہونے کی وضاحت ہو۔

اس طرح کے مضامین شائع کرنے والوں میں مولانا عتیق احمد صاحب بستوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء وکنوینز دارالقضاء کمیٹی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ ان کے مضامین میں سلجھے انداز میں شریعت اسلامی کی اہمیت وضرورت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کتاب میں ان کے دو اہم مضامین ''ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کا مسئلہ'' کے نام سے شائع کئے جارہے ہیں، جن سے ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کی قانونی اور دستوری صورت حال پورے طور پر واضح ہوتی ہے اور ہندوستان میں تحفظ شریعت کے مثبت طریقوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب بہت مفید ہوگی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور نافع بنائے۔ آمین!

(حضرت مولانا سید) محمد رابع حسنی ندوی (دامت برکاتہم)
۱۴۳۱/۰۳/۲۵ھ (صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
۲۰۱۰/۰۳/۱۲ء ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی تقریر سے ایک اقتباس

مجھ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ ہندو یا کسی اور ترقی پسند مذہب کے پیرو اپنے مذہب کے لئے کوئی قانون منظور کرائیں، لیکن میرا مذہب ترقی پسند نہیں، اس کا قانون خدا کی طرف سے بنا ہوا ہے، جیسا کہ میں نے اپنے بیان میں بتایا ہے، جو ۹؍نومبر ۱۹۲۹ء کو مسلمان علماء کے اس وفد کی طرف سے ہزا کسلنسی وائسرائے (Excellency) کو پیش کیا جس کی قیادت میں نے کی، اس کی ایک نقل میں یہاں منسلک کرتا ہوں، اس قسم کے اہم مسائل کا فیصلہ جلد بازی میں نہ کرنا چاہئے اور جب کوئی ایسا موقع آئے گا تو میں اس پر نگاہ رکھوں گا کہ کم از کم مسلمانوں کے مذہب کو انسان کے بنائے ہوئے قوانین سے بالاتر رکھنا چاہئے، خواہ قوانین ہندوستان یا برطانیہ کے پارلیمنٹ میں کیوں نہ بنائے جائیں۔ اس کے بغیر مسلمان کسی دستور کے وفادار نہیں ہوسکتے۔

(مولانا محمد علی کی یاد میں، ص: ۲۵۶، مصنفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

تمام شکر و سپاس اس ذات عالی کے لئے جس نے کائنات کی تخلیق فرما کر انسان کو شرف و کرامت سے بہرہ ور کیا، اور ایمان کی نعمت سے اہل ایمان کو سرفراز فرمایا اور درود وسلام خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (اور ان کے آل واصحاب) پر جنھوں نے عالم انسانیت کو آخری کتاب ہدایت سے روشناس کرایا اور اسلامی شریعت کی جڑیں اللہ کے فضل وتوفیق سے ایسی مستحکم فرمائیں کہ قیامت تک اس میں تحریف وتبدیل کی کوششیں کامیاب نہیں ہوسکتیں۔

ہندوستان کی ملت اسلامیہ کا یہ امتیاز رہا ہے کہ اس نے کبھی اپنے ایمان وعقیدہ دینی اقدار وروایات کا سودا نہیں کیا اور تاریخ کے ہر دور میں اپنے دینی وملی امتیازات کے ساتھ زندگی گذارنے کی کوشش کی۔ ہندوستان میں برطانیہ کے سامراجی دور میں بھی مسلمانوں نے اپنا سب کچھ کھودینے کے باوجود اپنی زندگی مذہبی خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی اور ایمان ویقین، شریعت اور مذہبی تشخص کا عزیز سرمایہ اپنے سینے سے لگائے رکھا۔

زیر نظر کتاب ''ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کا مسئلہ'' میں اگر ایک طرف تحفظ شریعت کے میدان میں اپنے اسلاف اور بزرگوں کی کوششوں پر روشنی ڈالی جائے گی تو دوسری طرف یہ معلوم ہوگا کہ موجودہ ہندوستان میں اسلامی شریعت کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) کن خطرات سے دوچار ہیں اور اس کے تئیں مسلمانان ہند کی کیا ذمہ داریاں ہیں، اگر انہیں اس ملک میں اپنے مذہب اور دینی

تشخص کے ساتھ زندگی گذارنا ہے تو انہیں کیا کیا اقدامات کرنے ہوں گے۔

اس کتاب کے پہلے مضمون میں مسلم پرسنل لا کے بارے میں موجودہ عدالتی رویہ پر روشنی ڈالی گئی اور اس عدالتی رویہ سے اسلام کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) پر کیا زد پڑتی ہے اس کی نشاندہی کی گئی ہے، ہماری عدالتیں اسلامی قوانین کی تشریح جس نہج پر کرنے لگی ہیں اور اسلامی قانون کے بنیادی مآخذ کتاب وسنت کی تعبیر وتشریح میں جو انداز اپنا رہی ہیں ان کی وجہ سے ۱۹۳۷ء کا اطلاقِ شریعت ایکٹ اپنی معنویت کھوتا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس صورتِ حال میں بہتر تبدیلی پیدا ہو۔

اس کتاب کے آخر میں پارلیمنٹ سے منظور شدہ پانچ ایکٹ کا اردو ترجمہ شامل کیا گیا ہے جن کا تعلق مسلم پرسنل لا سے ہے، ان میں سے چار ایکٹ آزادی سے پہلے برطانوی حکومت ہند کے دور کے منظور کردہ ہیں اور ایک ایکٹ آزاد ہندوستان کی پارلیمنٹ کا پاس کردہ ہے، ان کی اشاعت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے کتابچہ کی صورت میں کی تھی، افادیت کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے انہیں اس کتاب میں شامل کردیا گیا، پارلیمنٹ سے منظور کردہ ان قوانین کا مطالعہ کئے بغیر ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کے مسئلہ سے پورے طور پر واقف نہیں ہوا جاسکتا۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ہندوستان میں اتحاد ملت کا نقیب اور سرمایۂ ملت کا نگہبان ہے، اس کے سایہ تلے تحفظ شریعت کا کارواں سرگرم سفر ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نظر بد اور دشمنوں کی سازشوں سے اس کی حفاظت فرمائے اور بورڈ کے قائدین اور کارکنوں کو عزم وحوصلہ اور حکمت کے ساتھ تحفظ شریعت کی مہم سر کرنے کی توفیق دے۔

میں بارگاہ رب العزت میں سراپا شکر وسپاس کہ اس نے محض اپنے فضل سے اپنے دین وشریعت سے ایک نسبت عطا کی اور دین وشریعت کی خدمت اور اس کی نصرت ودفاع میں کچھ لکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔

مخدوم گرامی، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ، ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی دامت برکاتہم کے لئے میرے پاس شکریہ کے الفاظ نہیں ہیں، انہوں نے میری ادنیٰ گذارش پر اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود بہت تھوڑے وقت میں کتاب کے لئے قیمتی مقدمہ تحریر فرمایا، اللہ تعالیٰ ان کی عمر وصحت میں برکت عطا فرمائے اوران کا سایہ امت مسلمہ کے سروں پرتا دیر قائم رکھے۔

عتیق احمد بستوی

۱۴۳۱/۰۳/۲۷ھ — استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ،

۲۰۱۰/۰۳/۱۴ء — کنوینر دارالقضاء کمیٹی آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا ارشاد گرامی

اس بارے میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے جو لکھنؤ کی آل مسلم پارٹیز میں پیش آیا، وہ اگرچہ مسلمانوں کی خالص آزاد خیال جماعتوں کا اجتماع تھا، تاہم ان کے مباحثوں اور حجتوں میں پورے چار روز صرف ہوگئے تھے، ادھر الہ آباد میں آل پارٹیز کانفرنس کے لوگ لکھنؤ مسلم کانفرنس کے نمائندوں کے منتظر تھے جو کسی فیصلہ پر نہ پہنچ پاتے تھے۔ اسی اثناء میں کسی نے مولانا سید حسین احمد مدنی سے جو چاروں دنوں کے جلسوں میں خاموش بیٹھے رہے تھے پوچھا کہ حضرت آپ فرمایئے کہ اس بارے میں جمعیۃ العلماء کی رائے کیا ہے؟ آپ نے بڑے سکون سے فرمایا:

ہمارا تو ایک مطالبہ ہے جو ہم کانگریس کو دے چکے، وہ یہ کہ ملک کو اختیارات ملنے پر مسلمانوں کو اپنے مذہبی معاملات طے کرنے کے لئے قاضی مقرر کرنے کا حق عطا کیا جائے، اور ہم نے کہہ دیا ہے کہ جب تک کہ ملک کو آزادی حاصل نہ ہو ہم خاموشی کے ساتھ آزادی کی جنگ میں شریک رہیں گے، البتہ آزادی ملنے پر ہمیں یہ حق نہ ملا تو پھر اگر اس وقت ہم میں قوت ہوگی تو ہم اسے منوالیں گے۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل، دوسرا ایڈیشن، ص ۵۱۶-۵۱۷، مصنفہ سید طفیل منگلوری)

اسلام کے عائلی قوانین کے بارے میں
موجودہ عدالتی رویہ

ہندوستانی عدلیہ کا طرزِ عمل

احقر نے ۱۹۸۷ء میں اپنی کتاب ''ہندوستان اور نظام قضاء'' کے مقدمہ میں ہندوستان میں اسلام کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) کو لاحق خطرات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا تھا:

''ادھر چند برس سے ہندوستانی عدلیہ کا طرزِ عمل بھی اسلامی عائلی قوانین کے تعلق سے مسلمانوں کے لئے خاصا پریشان کن اور اضطراب انگیز ہوگیا ہے، ہندوستان کا یہ معزز ادارہ جس نے متعدد موقعوں پر عدل وانصاف کا نام روشن کیا، اور انتہائی نازک موقعوں پر بڑے عادلانہ اور جرأت مندانہ فیصلے دیے مسلم پرسنل لاء کے سلسلہ میں گومگو میں مبتلا نظر آتا ہے اور مسلم پرسنل لا کے قضیہ میں اس کی حیثیت جج کے بجائے فریق کی ہوگئی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں سپریم کورٹ کی آئینی بنچ نے شاہ بانو کیس میں جو فیصلہ دیا اس نے عدلیہ کے اس خطرناک رجحان کو واضح کردیا، اس فیصلہ میں ایک طرف بڑے صریح اور تیکھے انداز میں حکومت کو یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا مشورہ دیا گیا، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ''شریعت ایکٹ'' کی پابندی عدلیہ کو سخت ناگوار ہے، دوسری طرف نفقۂ مطلقہ اور حقوقِ مطلقہ کے سلسلہ کی قرآنی آیات کی ایسی من مانی تشریح کی گئی جس کی تائید چودہ سوسالہ اسلامی تاریخ میں کسی مفسر، فقیہ

وعالم کے قول سے نہیں ہوتی، اس فیصلے میں قرآنی آیات کی من مانی تعبیر وتشریح کی جو نظیر قائم کی گئی تھی اگر وہ باقی رہتی تو ''شریعت ایکٹ'' حرفِ بے معنی ہوکر رہ جاتا اور ہمارے دقیقہ سنج، نکتہ رس، ماہرین قانون جس قانون پر چاہتے کھینچ تان کر قرآن وسنت کی قبا فٹ کردیتے۔

مسلم پرسنل لاء بورڈ نے بالکل بروقت اس فیصلے کے خلاف رائے عامہ بیدار کی، بورڈ کی قیادت نے بڑی جرأت ودانشمندی سے اس فیصلے کے خلاف تحریک چلائی، مسلمانانِ ہند نے بڑے جوش وخروش سے اس تحریک کا استقبال کیا اور اسے تعاون دیا، بالآخر مسلمانوں کی سنجیدہ اور بامقصد جدوجہد رنگ لائی، مسلمانوں کی ہندوستان گیر تحریک اور دانشمندانہ افہام وتفہیم کے نتیجہ میں شاہ بانو کیس کے تباہ کن اثرات زائل کرنے کے لئے ہندوستان کی پارلیمنٹ نے مطلقہ بل منظور کیا۔ مطلقہ بل کے خلاف سپریم کورٹ میں متعدد رٹ دائر ہیں، اس لئے مطلقہ بل ابھی خطرے سے باہر نہیں ہے، اس کے علاوہ مسلم خواتین کے دائر کردہ متعدد مقدمات مختلف ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہیں، جن میں مسلم پرسنل لاء کو کلاً یا جزءاً چیلنج کیا گیا ہے۔''

(ہندوستان اور نظام قضاء ص ۱۶ تا ۱۸، دوسرا ایڈیشن)

احقر نے تقریباً ۲۳ سال پہلے ہندوستانی عدلیہ کی جس روش کا شکوہ کیا تھا، اس میں ماہ بہ ماہ، سال بہ سال اضافہ ہی ہوتا گیا، سپریم کورٹ اور ہائیکورٹس تک کے فاضل ججز ایسے فیصلے دے رہے ہیں جن میں اسلامی قانون کو پامال کیا گیا ہے اور قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کی من مانی تشریح کی گئی ہے، فاضل ججز کا پورا احترام کرنے کے باوجود ہم یہ لکھنے پر مجبور ہیں کہ اسلامی قانون کے اصل مصادر جس زبان میں ہیں (عربی زبان) اس سے وہ حضرات ناواقف ہیں، قرآن کریم، کتب احادیث اور فقہ کی بنیادی کتابوں تک ان کی رسائی نہیں ہے، نہ انہیں اسلامی قانون تفصیل سے

پڑھنے کا موقع ملا ہے، پھر بھی وہ ایسے ایسے فیصلے کر رہے ہیں جو قرآن وسنت اور اسلامی قانون کے سراسر خلاف ہیں اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ یہ فیصلے قرآن وحدیث اور اسلامی قانون کے نام پر کیے جا رہے ہیں۔

ان فیصلوں سے پہلے اگر ہماری عدالتوں نے کچھ وکلاء اور ماہرین سے مدد لی ہو اور ان کی فراہم کردہ معلومات اور بحثوں کی بنیاد پر یہ فیصلے کیے ہوں تو ہم پورے ادب کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ قرآن وحدیث اور اسلامی قانون کے بارے میں ان وکلاء اور ماہرین کا مطالعہ بڑا غلط بلکہ گمراہ کن ہے۔

موجودہ عدالتی رویہ پر تشویش وفکرمندی

اس گلوبل دور میں اسلامی شریعت کے بارے میں ہماری معزز عدالتوں کے یہ فیصلے پوشیدہ نہیں رہ سکتے، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس کے فیصلے تو کتابی صورت میں شائع ہوتے ہیں اور اب تو انٹرنیٹ کا دور ہے جس میں بڑی سرعت کے ساتھ علوم وافکار یہاں سے وہاں منتقل ہوتے رہتے ہیں، ہم بڑی تشویش اور فکرمندی کے ساتھ سوچتے ہیں کہ جب اس طرح کے فیصلے مسلم اور غیر مسلم ممالک کے علماء اور ماہرین اسلامی قانون کے نگاہوں سے گذرتے ہوں گے تو وہ ہماری عدالت ہائے عالیہ کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے ہوں گے۔

اسلام کے عائلی اور معاشرتی قوانین (نکاح، طلاق، میراث وغیرہ) ہماری اسمبلیوں یا پارلیمنٹ کے وضع کردہ قوانین نہیں ہیں جن کی مختلف تعبیر وتشریح کرنے کی عدالتوں کے لئے بڑی گنجائش ہو بلکہ اسلام کے عائلی اور معاشرتی قوانین کی بنیادیں کتاب وسنت میں استوار ہیں، چودہ سو سال سے یہ قوانین دنیا کے مختلف براعظموں اور ملکوں میں نافذ ہیں، انسانی تاریخ کے بہترین دماغوں (صحابہ، تابعین، مجتہدین وغیرہ) نے ان قوانین کی تشریح وتعبیر کا فریضہ انجام دیا ہے، اس قانون میں ایسا کوئی ابہام اور خلا نہیں ہے جسے دور کرنے اور پُر کرنے

کے لئے ہماری عدالتوں کے فاضل ججوں کو محنت اور مغز ماری کرنی پڑے۔

اسلامی شریعت کے تعلق سے ہر وہ رائے اور فیصلہ نا قابل قبول ہے جس کا ثبوت نہ قرآن وسنت سے ہے اور نہ اسلامی فقہ کے ذخیرہ میں اس کا کوئی سراغ لگتا ہے، ملک کی آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد بھی ایک مدت تک ہماری عدلیہ بھی اس کی پابند تھی کہ اسلامی قانون اور کتاب وسنت کی تشریح من مانے طریقے پر نہ کرے۔

عدلیہ غلط فیصلوں سے مبرّا نہیں ہوتی

بمبئی ہائیکورٹ (اورنگ آباد برانچ) کے فاضل ججز نے رٹ پٹیشن ۹۴-۲۰۰۰ (ڈگرو ولد چھوٹو پٹھان بہ نام رحیم بی) کے فیصلہ میں طلاق کے ایک مسئلہ میں مختلف ہائیکورٹس اور پریوی کونسل کے فیصلوں سے اختلاف کرتے ہوئے بڑے پتے کی بات لکھ دی ہے۔

"غلط فیصلوں سے مبرّا ہونا عدلیہ کی صفت نہیں ہے، مسلم علماء نے یہ رائے دی ہے کہ اسلامی قانون کی ہندبرطانوی عدلیہ نے جو تشریح کی ہے وہ قرآن مجید یا ارشاد نبوی (حدیث) کی منصفانہ ترجمانی نہیں کرتی، جب ڈاؤننگ اسٹریٹ (لندن) کی جوڈیشیل کمیٹی میں ہندوستان کے منو اور عرب کے (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قوانین کی تشریح کی جائے گی تو تھوڑی بہت تحریف وتبدیلی لازمی ہے، کسی ثقافت کی روح شرعی قانون اس فرقہ کے تہذیبی اصول ومعیار کا تشکیلی اور نافذ العمل ہونے کا اظہار ہوتا ہے جسے اجنبی ذہن پوری طرح سمجھ نہیں سکتے"۔ (پیراگراف نمبر ۱۸) (مسلم پرسنل لا اور عدالتوں کے فیصلے ص ۸۳)

ہمیں انتہائی تکلیف اور افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ بمبئی

ہائیکورٹ (اورنگ آباد بنچ) کے فاضل جج نے اسلامی قانون کی ہند برطانوی عدلیہ کے ذریعہ جس قسم کی تشریح کا شکوہ کیا ہے اس سے دسیوں گنا زیادہ شکوہ علماء اسلام اور ماہرین قانون شریعت کو خالص ہندوستانی عدلیہ کے بہت سے فیصلوں سے ہے جن میں ہائی کورٹس ہی نہیں سپریم کورٹ کے مختلف فیصلے بھی شامل ہیں، ان فیصلوں میں اسلامی قانون کی تشریح کرنے کے بجائے من مانی قانون سازی کی گئی ہے اور اپنے من پسند نظریہ وخیال پر کھینچ تان کر شریعت کی قبا فٹ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، بمبئی ہائی کورٹ کے زیر بحث فیصلہ سے پہلے ہم سپریم کورٹ کے ایک فیصلہ کا ایک اقتباس پیش کررہے ہیں، جس سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے فاضل جج اسلامی قانون کی تعبیر وتشریح کن بنیادوں پر کرنے لگے ہیں، مطلقہ بل ۱۹۸۶ء کے خلاف دانیال لطیفی وغیرہ کے دائر کردہ مقدمات رٹ پٹیشن سول نمبر ۸۶۸ سال ۱۹۸۶ء (جن میں مطلقہ بل کے آئینی جواز کو چیلنج کیا گیا تھا) کا فیصلہ کرتے ہوئے پیراگراف نمبر ۲۰ میں معزز جج نے لکھا ہے۔

فیصلہ کی بنیاد معاشی اور معاشرتی حالات

''۲۰- ایسے معاملات ودفعات کی تشریح کرتے ہوئے جن میں ازدواجی تعلقات زیر بحث آئیں ہمیں اپنے سماج میں مروج معاشرتی حالات کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ ہمارے سماج میں خواہ اس کا تعلق اکثریت کے فرقے سے ہو یا اقلیت سے جو بات نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان معاشی وسائل کے اعتبار سے بہت زیادہ عدم یکسانیت ہے، ہمارے سماج میں معاشی اور معاشرتی طور پر مردوں کا غلبہ ہے، اور عورتوں کو خواہ وہ سوسائٹی کے کسی طبقہ سے تعلق رکھتی ہوں ہمیشہ ایک ماتحت کا رول (کردار) ادا کرنا پڑتا ہے۔ شادی ہوجانے کے بعد اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتوں کو بھی اپنے تمام دیگر

مشاغل سے دستبردار ہوجانا پڑتا ہے اور وہ اپنے خاندان کی دیکھ بھال اور فلاح کے لئے خود کو وقف کردیتی ہیں، خصوصاً اپنے شوہر کے تعلق سے، اس کے جذبات واحساسات اور ذہنی وجسمانی صلاحیتیں سب شادی شدہ زندگی میں تحلیل ہوجاتی ہیں اور وہ اپنی انفرادیت کی ایک ایسی عظیم اور مقدس قربانی دیتی ہے جس کی قیمت واہمیت کو دولت کی میزان پر نہیں تولا جاسکتا، جب اس نوعیت کا یہ رشتہ ٹوٹتا ہے تو اس کی جذباتی شکستگی اور شادی شدہ زندگی پر اپنا سب کچھ لٹا دینے کے نقصان کی تلافی کے لئے ہم کیا کرتے ہیں؟ کسی کے پاس اس کا جواب نہیں ہے، یہ کہنا صرف ایک تھوڑا سا بہلاوا ہے کہ ایسی عورت کو اس کی گذر بسر کے لئے رقم ادا کی جائے، اور اس قسم کی راحت جو صنفی مساوات اور سماجی انصاف کے حصوں کی بنیادی حقوق کا حصہ ہے اسے عالمی طور پر ہر مذہب کے لوگ تسلیم کرتے ہیں۔

اور یہ سمجھنا مشکل ہے کہ مسلم لا ایک مختلف قسم کی ذمہ داری ایسے عناصر کو سونپنا چاہتا ہے جو عائلی زندگی سے غیر متعلق ہیں، جیسے وہ لوگ جو اس خاتون کی جائداد واثاثے کے وارث ہوں گے یا پھر وقف بورڈ، اس قسم کا انداز فکر ہمارے نزدیک ایک طرح سے سماجی حقائق کو مسخ کرنا ہے، ایسے عالمی وسعت واہمیت رکھنے والے سماجی مسائل جو بنیادی انسانی حقوق، ثقافت، زندگی کے وقار وشائستگی اور سماجی انصاف حاصل کرنے کے ضروری تقاضوں سے تعلق رکھتے ہوں، ان کو مذہب یا مذاہب، عقیدہ، قومیت مسلک، نسل یا فرقہ وارانہ عوامل کو چھوڑ کر دیگر پہلوؤں سے حل کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے۔ اس پہلو کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم زیر بحث ایکٹ کی دفعات کی تشریح کریں گے۔'' (مسلم پرسنل لا اور عدالتوں کے فیصلے ص ۲۴-۲۵

شائع کردہ لیگل سل آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نئی دہلی)

رٹ پٹیشن سول نمبر ۸۶۸ سال ۱۹۸۶ء بعدالت سپریم کورٹ آف انڈیا (دانیال لطیفی ودیگر بہ نام یونین آف انڈیا) میں سپریم کورٹ کی آئینی بنچ (جو پانچ ججز پر مشتمل تھی) نے ستمبر ۲۰۰۱ء میں جو فیصلہ دیا اس کا ایک تمہیدی حصہ اوپر نقل کیا گیا، اس سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ ہماری عدالت عالیہ کے فاضل جج صاحبان کا انداز فکر یہ ہے کہ وہ اسلامی قانون بابت نکاح وطلاق کی تعبیر وتشریح میں قرآن وحدیث اور بنیادی کتب فقہ کو زیادہ اہمیت دینے کے بجائے اصل اہمیت سماجی ومعاشی حالات کو دیں گے اور اسی عینک سے آیات واحادیث اور قانون اسلامی کی تشریح کریں گے، سماجی ومعاشی حالات کے بارے میں ان کا مطالعہ ان کے فیصلوں کی بنیاد بنے گا۔

آئینی بنچ کے فاضل جج نے مذکورہ بالا پیراگراف میں جو جذباتی گفتگو کی ہے اس کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے پر اس کی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے اور استدلال انتہائی کمزور نظر آتا ہے، فاضل جج کا ارشاد ہے

سماج میں مردوں کے غلبہ کا شکوہ

’’ہمارے سماج میں معاشی اور معاشرتی طور پر مردوں کا غلبہ ہے اور عورتوں کو خواہ وہ سوسائٹی کے کسی طبقے سے تعلق رکھتی ہوں ایک ماتحت کا رول ادا کرنا پڑتا ہے‘‘۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ صرف ہمارے ملک اور سماج کی بات ہے؟ دنیا کا کون سا ملک یا سماج ہے جس میں معاشی اور معاشرتی طور پر مردوں کے بجائے عورتوں کا غلبہ ہے یا دونوں بالکل برابر کی پوزیشن میں ہیں، کیا دنیا کے کسی بڑے سے بڑے ترقی یافتہ ملک (امریکہ اور یورپ کے ممالک) کے بارے میں بھی بتایا جاسکتا ہے کہ وہاں معاشی اور معاشرتی طور پر عورتوں کا غلبہ ہے، غلبہ تو ہمیشہ مردوں

کا رہے گا، لیکن مردوں کے غلبہ کا مطلب عورتوں کی مظلومیت نہیں، اللہ سے ڈرنے والے مرد غالب ہونے کے باوجود عورتوں کے ساتھ انصاف کرتے ہیں، ان کے ساتھ عادلانہ ہی نہیں بلکہ فیاضانہ برتاؤ کرتے ہیں۔

کیا شادی سے عورت کی انفرادیت ختم ہوجاتی ہے؟

فاضل جج لکھتے ہیں:

’’شادی ہوجانے کے بعد اکثر اعلی تعلیم یافتہ عورتوں کو بھی اپنے تمام دیگر مشاغل سے دستبردار ہوجانا پڑتا ہے اور وہ اپنے خاندان کی دیکھ بھال اور فلاح کے لئے خود کو وقف کردیتی ہیں خصوصاً اپنے شوہر کے تعلق سے، اس کے جذبات واحساسات اور ذہنی وجسمانی صلاحیتیں سب شادی شدہ زندگی میں تحلیل ہوجاتی ہیں اور وہ اپنی انفرادیت کی ایک ایسی عظیم اور مقدس قربانی دیتی ہے جس کی قیمت واہمیت کو دولت کی میزان پر تولا نہیں جاسکتا‘‘۔

جس وقت ہمارے فاضل جج نے مذکورہ بالا سماجی تجزیہ پیش کیا تھا اس وقت ممکن ہے کہ ان کا تجزیہ بڑی حد تک درست رہا ہو، اب تو صورت حال اس سے کافی مختلف ہے، اب تو ہمارے نوجوانوں کا ایک طبقہ اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتوں سے بلکہ برسر روزگار عورتوں سے نکاح اسی لئے کرتا ہے کہ ان کی تنخواہوں سے ٹھاٹ کے ساتھ گھر کا خرچ چل سکے اور اگر خود بھی ملازمت اور کاروبار سے جڑ سکے تو معیار زندگی مزید بلند ہوجائے، ماں باپ دونوں کی ملازمت اور مصروفیات نے گھر کو ویران کردیا ہے، بچوں کو ماں کی شفقت ومحبت اور باپ کی مشفقانہ تربیت سے محروم کردیا ہے اس کی وجہ سے ایسا تربیتی اور سماجی بحران پیدا ہوگیا ہے جس نے ماہرین سماجیات کی عقلوں کو حیران وپریشان کردیا ہے، معاش کی اس دوڑ کی وجہ سے نئی نسل کی ذہنی تربیت کا کام بری طرح متاثر ہوا ہے اور بچے

مختلف قسم کی جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔ معصوم اور بے زبان بچے تو اس قابل نہیں ہیں کہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹا سکیں اور عدالت عالیہ تک اپنا درد وکرب پہنچا سکیں۔

ازدواجی رشتوں کا عدم استحکام

دوسری طرف میاں بیوی دونوں کی معاشی خود کفالتی اور معاشی دوڑ بھاگ نے ازدواجی رشتوں کے استحکام کو بری طرح متاثر کیا ہے، میاں بیوی جب دونوں اچھی ملازمت سے جڑے ہوتے ہیں، دونوں معاشی لحاظ سے پورے طور پر خود کفیل ہوتے ہیں اور دونوں معاش کی دوڑ سے تھکے ہارے گھر واپس آتے ہیں تو دونوں کے ازدواجی تعلقات میں گرم جوشی باقی نہیں رہتی، ایک دوسرے کی بات برداشت کرنے کی قوت کمزور پڑ جاتی ہے اس کے نتیجے میں ازدواجی رشتوں میں دراڑ پڑنے لگتی ہے اور خوشگوار ازدواجی زندگی کا خواب چکنا چور ہونے لگتا ہے اور انتہائی تلخی کے ساتھ رشتہ ختم ہونے کی نوبت آجاتی ہے، ایسی صورت میں جب قانون اور عدالت زبردستی اس رشتے کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو ان کی زندگی میں زہر گھل جاتا ہے اور دونوں کی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔

میاں بیوی کا بعض معاملات میں ایک دوسرے پر انحصار ازدواجی رشتے کو قوت بخشتا ہے اور رشتے کو ٹوٹنے سے بچاتا ہے، آج کل ہمارے ملک میں عورتوں کو ملازمت اور کاروبار میں لانے اور مردوں کو بے روزگاری کے دلدل میں پھینکنے کی جو ہوڑ چل رہی ہے اس کے تباہ کن اثرات سامنے آنے شروع ہوگئے ہیں اور چند سالوں میں اس کی ہولناکی بالکل عیاں ہوجائے گی، مردوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آگیا ہے جو عورتوں کی کمائی پر عیش کررہا ہے، ان میں سے کچھ تو امور خانہ داری کسی طرح سنبھال لیتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو امور خانہ داری بھی انہیں عورتوں کے سر پر لادتے ہیں جو کاموں کے بوجھ سے تھک کر گھر واپس آتی ہیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر

ہماری عدالت عالیہ سماجی صورتحال کی جو بھی عکاسی کرے لیکن اسلام اس نقطۂ نظر کو بالکل مسترد کرتا ہے کہ شادی کرنے سے عورت اپنی انفرادیت کھو دیتی ہے، ''اپنی انفرادیت کی عظیم اور مقدس قربانی'' کا نظریہ ہوسکتا ہے کہ بعض دوسرے مذاہب اور اقوام کے تعلق سے درست ہو (مثلاً ہندو مذہب) لیکن اسلام اس نظریہ کی سختی سے تردید کرتا ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق نکاح سے نہ عورت اپنے خاندان سے (جہاں وہ پیدا ہوئی اور پلی بڑھی) کٹ جاتی ہے اور نہ ہی وہ اپنی انفرادیت کھو دیتی ہے جیسا کہ ہندو مذہب کی تعلیمات سے ظاہر ہوتا ہے، شادی کے بعد بھی تمام خاندانی رشتے اور ان سے جنم لینے والے حقوق وفرائض برقرار رہتے ہیں اور شادی سے عورت کی انفرادیت تحلیل نہیں ہوتی بلکہ میاں بیوی دونوں کی شخصیت اور انفرادیت میں نکھار آتا ہے، بیوی کے مالی، سماجی اور معاشرتی حقوق میں شادی کے بعد اضافہ ہی ہوتا ہے، شادی کے ذریعہ ''انفرادیت کی عظیم اور مقدس قربانی'' ہی کا نظریہ تھا جس نے ستی جیسی رسم کو ہندو مذہب میں قابل قبول بلکہ کار ثواب بنادیا تھا، کاش کہ ہماری عدالت عالیہ کے قلم سے اس نظریہ کی تحسین نہ ہوتی۔

کیا رشتہ ٹوٹنے کے ہر کیس میں شوہر ہی قصور وار ہوتا ہے؟

رشتہ ٹوٹنے کا ذکر ہمارے قابل احترام فاضل جج نے جس جذباتی انداز میں کیا ہے اسے ہم عدلیہ کا لب ولہجہ تو نہیں کہہ سکتے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رشتہ ٹوٹنے کے ہر کیس میں شوہر ہی کی زیادتی ہوتی ہے، عورت ہمیشہ مظلوم ہی ہوتی ہے، حالانکہ یہ صورت حال کی صحیح عکاسی نہیں ہے، بہت سے کیسز میں عورتوں کی زیادتیاں ہوتی ہیں بلکہ عورتوں کے اصرار ومطالبہ پر رشتہ ختم کیا جاتا ہے، اگر ایسے معاملات بیس فیصد ہی ہوں تو بھی عدلیہ کو اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

عدالت عالیہ کے فاضل جج لکھتے ہیں:

’’اور اس قسم کی راحت جو صنفی مساوات اور سماجی انصاف کے حصوں کے بنیادی حقوق کا حصہ ہے اسے عالمی طور پر ہر مذہب کے لوگ تسلیم کرتے ہیں اور یہ سمجھنا مشکل ہے کہ مسلم لا ایک مختلف قسم کی ذمہ داری ایسے عناصر کو سونپنا چاہتا ہے جو عائلی زندگی سے غیر متعلق ہیں جیسے وہ لوگ جو اس خاتون کی جائداد و اثاثے کے وارث ہوں گے یا پھر وقف بورڈ اور اس قسم کا انداز فکر ہمارے نزدیک ایک طرح سے سماجی حقائق کو مسخ کرتا ہے، ایسے عالمی وسعت و اہمیت رکھنے والے سماجی مسائل جو بنیادی انسانی حقوق، ثقافت، زندگی کے وقار اور شائستگی اور سماجی انصاف حاصل کرنے کے ضروری تقاضوں سے تعلق رکھتے ہوں، ان کو مذہب یا مذاہب، عقیدہ، قومیت، مسلک، نسل یا فرقہ وارانہ عوامل کو چھوڑ کر دیگر پہلوؤں سے حل کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے، اس پہلو کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم زیر بحث ایکٹ کی دفعات کی تشریح کریں گے‘‘۔

جب ہماری عدالت عالیہ بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے نکاح وطلاق کے مسائل کو اسلامی قانون کی روشنی میں حل کرنے کے بجائے صنفی مساوات، سماجی انصاف اور بنیادی حقوق کے حوالہ سے حل کرنا چاہتی ہے اور یہ تلقین کر رہی ہے کہ ’’ان مسائل کو مذہب، عقیدہ، قومیت، مسلک، نسل یا فرقہ وارانہ عوامل کو چھوڑ کر دیگر پہلوؤں سے حل کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے‘‘ تو اب اس سے کوئی شکوہ شکایت بیکار ہے، سپریم کورٹ نے اپنے متعدد فیصلوں میں حکومت ہند پر زور دیا ہے کہ دستور کی دفعہ نمبر ۴۴ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے یونیفارم سول کوڈ (یکساں شہری قانون) مرتب کرکے نافذ کرے، ہماری عدالت عالیہ نے محسوس کیا کہ اتنے اہم کام سے حکومتیں اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر پہلو تہی کر رہی ہیں تو ہمارے فاضل جج نے طے کرلیا کہ اپنے فیصلوں کے ذریعہ قانون

سازی کے اس مقدس کام کو ہمیں انجام دینا ہے اور یونیفارم سول کوڈ کو ایک حقیقت واقعہ بنا کر رہنا ہے۔

۱۹۳۷ء کا شریعت ایکٹ جو ہماری عدلیہ کو سنگ گراں محسوس ہو رہا تھا اسے اپنے فیصلوں کی ٹھوکر سے ریزہ ریزہ کرنے کا عمل جاری ہے، عدالت عالیہ کا سگنل پاکر نیچے کی عدالتوں نے بھی اسلام کے عائلی قوانین کو پامال کرنے والے فیصلوں کی جھڑی لگادی۔

فیصلے کا تضاد

طرفہ تماشا یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے فاضل جج ایک طرف یہ ریمارک کرتے ہیں:

’’یہ سمجھنا مشکل ہے کہ مسلم لا ایک مختلف قسم کی ذمہ داری ایسے عناصر کو سونپنا چاہتا ہے جو عائلی زندگی سے غیر متعلق ہیں جیسے وہ لوگ جو اس خاتون کی جائداد و اثاثے کے وارث ہوں گے یا پھر وقف بورڈ، اور اس قسم کا انداز فکر ہمارے نزدیک ایک طرح سے سماجی حقائق کو مسخ کرنا ہے‘‘۔

دوسری طرف اسی فیصلہ کے پیراگراف نمبر ۳۶-۱۱۱- میں لکھتے ہیں:

ایک مسلم مطلقہ عورت جس نے دوسری شادی نہیں کی ہے اور جو عدت کے بعد اپنا خرچہ خود برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے تو دفعہ نمبر ۴ کے تحت ان رشتہ داروں کے خلاف استغاثہ کرسکتی ہے جو اسی مطلقہ عورت کی موت کے بعد مسلم قانون کے مطابق ان کی جائداد اثاثوں وغیرہ کے تناسب کے اعتبار سے وارث ہوں گے اور جن میں اس کے بچے بھی شامل ہیں اور جن کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مطلقہ عورت کی وراثت کے تناسب کے اعتبار سے کفالت کا بار برداشت

کریں، اگر ان رشتہ داروں میں سے کسی رشتہ دار میں کفالت کا بار اٹھانے کی صلاحیت نہ ہو تو مجسٹریٹ اس ایکٹ کے تحت وقف بورڈ کو ہدایت جاری کرسکتا ہے کہ وہ یہ خرچہ ادا کرے‘‘۔ (مسلم پرسنل لا اور عدالتوں کے فیصلے ص ۳۸، ۳۹)

سپریم کورٹ کی یہ آئینی بنچ مسلم مطلقہ خاتون پر اتنی مہربان ہے کہ عدت کے بعد اس عورت کے نان نفقہ کا دوہرا نظم کردیا ہے، ایک طلاق دینے والے شوہر کی طرف سے، دوسرا رشتہ داروں یا وقف بورڈ کی طرف سے۔

سپریم کورٹ کی آئینی بنچ کے فیصلہ کا ایک اقتباس یہ بتانے کے لئے نقل کیا گیا کہ ہمارے فاضل ججز اب اسلام کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور خالص اسلامی قانون سے متعلق ایک بل (مسلم مطلقہ بل) کی تشریح کن بنیادوں پر کررہے ہیں، فی الحال تو ہم بمبئی ہائیکورٹ (اورنگ آباد بنچ) کے طلاق سے متعلق ایک فیصلہ کا مختصر اقتباس نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، بمبئی ہائیکورٹ کا فیصلہ طلاق کے لئے ایسی شرطیں عائد کرتا ہے جس کا کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی کتابوں میں کوئی ذکر نہیں ملتا، یہ عدالت کی طبع زاد شرطیں ہیں جس کے لئے بعض آیات قرآنی کا سہارا لیا گیا ہے۔

فیصلہ کے پیراگراف نمبر ۲۶ میں ہے:

’’اوپر کی بحث سے واضح ہوجاتا ہے کہ شوہر کی طرف سے صرف طلاق کے الفاظ ادا کرنا یا طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کرنا یا اس کا یہ قول کہ وہ پہلے ہی طلاق دے چکا ہے کافی نہیں ہیں، اور قانون کے مطلوبات کو پورا نہیں کرتے، طلاق کا حق استعمال کرنے کے لئے شوہر کو لازم ہے کہ وہ پہلے مصالحت کے لئے ثالثوں کی کوشش کی شرط پوری کرے، اور طلاق کے لئے معقول وجہ بیان کرے، بیوی کو طلاق دینے کے ارادے سے مطلع کرنا ہی قانونی مطلوبات کے لئے کافی نہیں ہے،

اگر کوئی عورت عدالت میں طلاق کے خلاف استغاثہ دائر کرے تو شوہر کے لئے ضروری ہے کہ وہ طلاق کے بارے میں جملہ شرائط پر عمل کرنے یعنی بیوی کو اپنے ارادے سے مطلع کرنے، ثالثوں کی تقرری، ثالثوں کے ذریعہ مصالحتی کوششوں کا آغاز، فریقین کے درمیان مصالحت ناکام ہونے کی وجوہات، طلاق کی معقول وجہ اور تمام کوششوں کی ناکامی کے بعد طلاق دینے کے ثبوت فراہم کرے، محض عدالت میں تحریری یا اور کسی شکل میں بیان دینے یا زبانی طور پر یہ گواہی دینے سے کہ شوہر ماضی قریب میں اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہے یہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ شوہر نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی‘‘۔ (مسلم پرسنل لا اور عدالتوں کے فیصلے ص ۹۸، ۹۹)

بمبئی ہائیکورٹ (اورنگ آباد بنچ) کے مذکورہ بالا فیصلہ کا مختصر جائزہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سکریٹری اور خانقاہ رحمانیہ مونگیر کے سجادہ نشیں حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب نے اپنے رسالہ (طلاق کے متعلق بمبئی ہائی کورٹ کا تازہ فیصلہ عدالتی روایات کے پس منظر میں) میں لیا ہے۔

مولانا موصوف کا جائزہ مختصر ہونے کے باوجود بڑا عالمانہ اور دانشورانہ ہے لیکن اس فیصلہ کے تفصیلی جائزہ کی ضرورت اب بھی باقی ہے، خصوصاً اس لئے کہ سپریم کورٹ نے شمیم آراء کیس (کریمنل اپیل ۴۶۵ (۱۹۹۶ء) فیصلہ ۱/اکتوبر ۲۰۰۲ء) میں جو فیصلہ صادر کیا ہے اس میں زیادہ تر بمبئی ہائیکورٹ کے فیصلہ میں ذکر کردہ دلائل اور حوالوں کو بنیاد بنایا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ جلد ہی سپریم کورٹ اور ہائیکورٹس کے کچھ اس طرح کے فیصلوں کا علمی تجزیہ پیش کیا جائے گا، تاکہ علمی اور قانونی حلقے ان فیصلوں کی کمزوریوں اور بھیانک غلطیوں سے واقف ہوسکیں۔

سپریم کورٹ کا ایک فیصلہ

اور

یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی کوششیں

۱۰ رمئی ۱۹۹۵ء کو سپریم کورٹ کے دو ججوں جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس آر، ایم سہائے پر مشتمل ایک بنچ نے تبدیلیٔ مذہب کے بعد دوسری شادی کے بارے میں جو فیصلہ دیا اس کے نتیجہ میں ایک بار پھر یکساں سول کوڈ کا مسئلہ قومی صحافت کی شاہ سرخی بن گیا، اس فیصلہ نے ہندوستان کے مسلمانوں اور دیگر مذہبی اقلیتوں میں بجا طور پر اضطراب کی لہر دوڑا دی۔

فیصلہ کا خلاصہ

چار ہندو عورتوں نے اپنے شوہروں کے خلاف یہ دعوی کیا تھا کہ ان کے شوہروں نے اسلام قبول کیا اور دوسری شادیاں کرلیں لہذا ان کے شوہروں پر تعزیرات ہند کی دفعہ نمبر ۴۹۴ کا اطلاق کرتے ہوئے دوسری شادی کو باطل ٹھہرایا جائے اور سزا نافذ کی جائے۔

سپریم کورٹ نے حالیہ فیصلہ میں ہندو عورتوں کی دادرسی کرتے ہوئے ان کے نومسلم شوہروں کی دوسری شادی کو باطل اور غیر قانونی قرار دیا اور کہا کہ ایک ہندو شوہر کا مذہب اسلام قبول کرلینے کے بعد دوسری شادی کرلینا انصاف، مساوات اور نیک چلنی کی صریح خلاف ورزی ہے، اور انصاف کی اصل روح کی

بنیاد پر شادی ناجائز ہے۔

سپریم کورٹ کے فاضل ججوں نے زیر بحث مقدمہ کے حدود سے تجاوز کرتے ہوئے اپنے فیصلوں میں سارا زور یکساں سول کوڈ کے نفاذ پر دیا ہے، ان کے اس فیصلہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عورتوں پر ہونے والے مظالم اور دوسری سماجی خرابیوں کا اصل سبب یکساں سول کوڈ کا عدم نفاذ ہے، اور جس دن یکساں کوڈ ملک میں نافذ ہوجائے گا تمام سماجی خرابیاں دور ہوجائیں گی اور عورتوں پر مظالم کا سلسلہ یکسر موقوف ہوجائے گا۔

فاضل ججوں کو شکوہ ہے کہ اب تک کی تمام حکومتوں نے دستور کی دفعہ نمبر ۴۴ (جس میں یکساں سول کوڈ جاری کرنے کی سفارش کی گئی ہے) کو نظر انداز کیا اور اس سمت میں قدم نہیں اٹھائے، حالیہ فیصلہ میں حکومت ہند کو یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور حکومت کو ہدایت دی گئی ہے کہ اگست ۱۹۹۶ء تک ایک حلف نامہ داخل کرے جس میں اس بات کی وضاحت ہو کہ تمام شہریوں کے لئے یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کے سلسلہ میں اس نے کیا کیا اقدامات کئے۔

جسٹس کلدیپ کے نزدیک یکساں سول کوڈ سے مراد ہندو کوڈ بل ہے، ان کے نزدیک یکساں سول کوڈ کے نام پر ہندو کوڈ بل تمام شہریوں پر نافذ کردینا چاہئے، موصوف لکھتے ہیں:

> "جب ہندوستان کے اسی فیصد سے زیادہ شہری ایک پارلیمنٹ کے ذریعہ مدون شدہ پرسنل لا کے تحت لائے جاچکے ہیں (اشارہ ہے ہندو قانون نکاح، ہندو قانون وراثت، ہندو قانون طفولیت وولدیت اور ہندو قانون تبنیت – ہندو کوڈ بل – کی طرف جو ۱۹۵۵ء، ۱۹۵۶ء میں پارلیمنٹ نے مدون کئے) تو کوئی وجہ نہیں کہ یونیفارم سول کوڈ کیوں نہ نافذ کردیا جائے"۔

دستور ہند کی دفعہ نمبر ۲۵ میں ہندوستان کے ہر شہری کو اپنی پسند کا مذہب

اختیار کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق دیا گیا ہے، نکاح، طلاق وغیرہ کا مذہبی عمل ہونا اتنی بدیہی حقیقت ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، دنیا کے تقریباً ہر سماج میں اسے مذہبی عمل تصور کیا جاتا ہے، اسی لئے جسٹس آر، ایم سہائے نے بھی اپنے علیحدی فیصلہ میں اعتراف کیا ہے ''نکاح، طلاق، وراثت اپنی نوعیت کے اعتبار سے ویسے ہی مذہبی ہیں جیسے مذہبی اعتقادات اگنی کے ساتھ سات پھیرے، یا قاضی کے سامنے ایجاب وقبول ایسے ہی اعتقادی اعمال ہیں جیسے کہ خود عملی عبادت''، لیکن پرسنل لاز کو سبوتاژ کرنے کے حد درجہ شوق میں جسٹس کلدیپ نے مذکورہ بالا بدیہی حقیقت کا بھی انکار کیا ہے، موصوف لکھتے ہیں:

''آرٹیکل چوالیس اس تصور پر مبنی ہے کہ ایک مہذب اور متمدن سوسائٹی میں مذہب اور پرسنل لا کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوتا دستور کا آرٹیکل پچیس مذہبی آزادی کی ضمانت تو ضرور دیتا ہے لیکن آرٹیکل چوالیس معاشرتی تعلقات اور پرسنل لا کو مذہب کے دائرہ سے خارج کردیتا ہے''۔

فیصلہ کا تجزیہ

سپریم کورٹ کے زیر بحث فیصلہ کی روشنی میں یکساں سول کوڈ کے مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم نومسلموں کے نکاح ثانی پر عائد پابندی اور اس کے سنگین نتائج کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں:

ہندو کوڈ بل مرتب اور منظور ہونے سے پہلے ہندو سماج میں طلاق کا تصور موجود نہیں تھا، ہندو مذہب میں نکاح اٹوٹ مقدس رشتہ تھا جسے کسی حال میں ختم نہیں کیا جاسکتا، حتی کہ شوہر کی وفات کے بعد بھی بیوی متوفی شوہر کی بیوی تصور کی جاتی تھی، بیوہ عورتوں کے لئے دوسری شادی کی گنجائش نہیں تھی یا تو بیوہ عورت

شوہر کے ساتھ ''وفاداری'' کا ثبوت دیتے ہوئے شوہر کی چتا میں کود جائے اور اپنے کو نذر آتش کرلے یا اپنی جوان عمری کے باوجود شوہر کے بغیر ذلت اور کسمپرسی کی زندگی گذارے۔

۵۶-۱۹۵۵ء میں ہندو کوڈ بل پارلیمنٹ میں منظور ہوا تو اس میں طلاق کی دفعات شامل کی گئیں، ہندو کوڈ بل میں طلاق کی گنجائش انتہائی محدود دائرہ میں رکھی گئی ہے جس سے طلاق کی واقعی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں، طلاق عدالت ہی کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے، عدالت میں عورت کے بارے میں بدکاری اور ناجائز تعلق کا الزام ثابت کرنے کے بعد ہی ناپسندیدہ بیوی سے رہائی حاصل کی جاسکتی ہے، ہندو کوڈ بل میں طلاق کا دائرہ اس قدر تنگ کردینے کی وجہ سے بہت سے ہندو شوہر جو ہر حال میں اپنی ناپسندیدہ بیویوں سے رہائی چاہتے ہیں تین راستوں میں سے کوئی ایک راستہ اپناتے ہیں۔

۱- قانون کے ڈر سے بیوی کو علیحدہ تو نہیں کرتے لیکن کسی دوسری عورت یا عورتوں سے ناجائز تعلق قائم کرلیتے ہیں، داشتہ رکھ لیتے ہیں اور شوہر بیوی کی ازدواجی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔

۲- بعض شوہر بیوی پر عدالت میں بدکاری کے جھوٹے الزامات عائد کرکے اور جھوٹے گواہ کھڑے کرکے طلاق حاصل کرلیتے ہیں اور اگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی یا عدالت میں جھوٹا مقدمہ قائم کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تو کسی طرح بیوی کو قتل کرڈالتے ہیں، یا زہر کھلا دیتے ہیں اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ کسی اتفاقی حادثہ میں بیوی کی موت ہوگئی یا اس نے خود زہر کھا کر اور پھندا لگا کر خودکشی کرلی، ایسے مجرم کبھی قانون کی زد میں آ بھی جاتے ہیں اور اکثر اپنا جرم چھپانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

۳- بعض ہندو شوہر اپنی ناپسندیدہ بیویوں سے رہائی کے لئے مذہب تبدیل کرنے کا راستہ اختیار کرتے ہیں، وہ اپنے عقائد واعمال کے اعتبار سے

ہندو مذہب پر قائم رہتے ہیں لیکن بیوی سے رہائی کے لئے عدالت میں اسلام قبول کرنے کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ قانون کی نگاہ میں ہندو رہتے ہوئے نہ وہ اپنی ناپسندیدہ بیوی سے رہائی پاسکتے ہیں نہ دوسری شادی کرسکتے ہیں۔

اگر ہمارے جج صاحبان غیر جانبداری سے صورت حال کا جائزہ لیتے تو اس نتیجہ تک پہنچتے کہ ہندو کوڈ بل کے قانونِ طلاق میں تبدیلی لانے اور اسباب طلاق کا دائرہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے، شوہر جب بیوی سے اس قدر متنفر اور بیزار ہو کہ اس سے رہائی کے لئے وہ تبدیلیٔ مذہب جیسا آخری قدم اٹھانے پر آمادہ ہے ایسی حالت میں قانونی جبر سے دونوں کو نکاح کی رسی میں باندھے رکھنا انتہائی نامعقول بات ہے، رشتہ نکاح الفت ومحبت اور اعتماد کی فضا میں پروان چڑھتا ہے نا کہ نفرت، عدات اور بےاعتمادی کی فضا میں، جو ہندو شوہر اپنی بیویوں سے آخری درجہ میں متنفر اور بیزار ہیں اگر ہماری عدالت عالیہ نے ان کے لئے تبدیلیٔ مذہب کے ذریعہ ناپسندیدہ بیویوں سے رہائی کا راستہ بند کردیا تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ عورتوں پر مظالم ڈھانے، انہیں قتل کرنے اور جلانے کے اعداد وشمار بڑھ جائیں گے، ایسا کرنا عورتوں کے ساتھ خیر خواہی اور انصاف نہیں بلکہ ان پر بدترین ظلم وستم ہے۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ اور نومسلموں کی مشکلات

سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کی زد صرف ان ہندو شوہروں پر نہیں پڑتی جنہوں نے تبدیلیٔ مذہب کو صرف ایک قانونی حربہ کے طور پر استعمال کیا ہے اور حقیقت میں انہوں نے ہندو مذہب ترک نہیں کیا ہے بلکہ وہ نومسلم بھی اسی فیصلہ کی زد میں بری طرح آگئے ہیں جنہوں نے پورے غور وفکر کے بعد صدق دل سے اسلام قبول کیا ہے، ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی مظلومیت اور کسمپرسی کے باوجود بہت سے برادرانِ وطن مختلف مذاہب میں سچائی کی تلاش کے بعد حلقہ

بگوش اسلام ہوتے ہیں، اسلام کے عقائد عبادات، اخلاق واحکام کی خوبیاں انہیں اپنی طرف کھینچتی ہیں، برادرانِ وطن میں جس قدر تعلیم عام ہورہی ہے، مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا رجحان بڑھ رہا ہے، ان کی سعید روحوں میں تلاش حق کا جذبہ بیدار ہورہا ہے، قومی پریس کی اسلام دشمن مہم کے باوجود بہت سے بندگانِ خدا اسلام قبول کررہے ہیں۔

سپریم کورٹ کے زیر بحث فیصلہ نے نومسلموں کے لئے بڑی مشکلات کھڑی کردی ہیں، اگر ایک ہندو غور وفکر اور مطالعہ وتحقیق کے بعد اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے، اور اپنے اس مطالعہ واحساس کے نتیجہ میں اس نے اسلام قبول کرلیا تو اس نے کوئی خلاف قانون اور غیر آئینی کام نہیں کیا بلکہ اپنے ایک آئینی حق کا استعمال کیا، دستور ہند کی دفعہ ۲۵ ہندوستان کے ہر شہری کو اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق دیتی ہے۔

ہندو شوہر کے اسلام قبول کرلینے کے بعد اگر عدت کے اندر اس کی ہندو بیوی بھی اسلام قبول کرلیتی ہے تو دونوں کا نکاح شرعاً اور قانوناً دونوں طرح باقی رہتا ہے اور اگر اپنے قدیم مذہب پر عورت قائم رہتی ہے اور تبدیلیٔ مذہب کے لئے آمادہ نہیں ہوتی تو اسلام کی نظر میں عدت گذرتے ہی نومسلم شوہر سے اس کا نکاح ختم ہوجاتا ہے، نومسلم مرد کے لئے وہ ہندو بیوی حرام ہوگئی، اگر شوہر اس سے جنسی تعلق قائم کرے گا تو یہ حرام کاری ہوگی لیکن سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کے مطابق ہندو کوڈ بل کی نظر میں دونوں کا نکاح حسبِ سابق باقی ہے، نومسلم شوہر پر اس معنی میں ہندو کوڈ بل نافذ ہے کہ اگر اس نے دوسرا نکاح کیا تو یہ نکاح ناجائز اور باطل نیز قابل سزا تصور کیا جائے گا۔ تعزیرات ہند کی دفعہ ۴۹۴ کے تحت اسے سزا دی جائے گی، لیکن شوہر چونکہ خود اسلام قبول کرچکا ہے لہذا ہندو کوڈ بل کے تحت طلاق حاصل کرنے وہ عدالت نہیں جاسکتا قانوناً اس کا نکاح ختم ہونے کی

صرف ایک صورت ہے وہ یہ کہ اس کی ہندو بیوی شوہر کے مذہب تبدیل کر لینے کی وجہ سے طلاق کا مطالبہ لے کر عدالت جائے اور عدالت اس کا یہ مطالبہ تسلیم کر کے دونوں کا نکاح ختم کر دے پھر نومسلم مرد کہیں اور نکاح کر سکتا ہے۔

نومسلم کی ہندو بیوی اگر طلاق کا مطالبہ لے کر عدالت نہیں جاتی تو نو مسلم شوہر بڑی قانونی پیچیدگی میں مبتلا ہو جاتا ہے، ہندو کوڈ بل کی وجہ سے وہ دوسری شادی نہیں کر سکتا اگر دوسری شادی کرتا ہے تو تعزیرات ہند کی دفعہ ۴۹۴ کا اس پر نفاذ ہوتا ہے اور اگر وہ قانون کے ڈر سے دوسری شادی نہیں کرتا اور پہلی بیوی ہی سے ازدواجی تعلقات قائم رکھتا ہے تو اپنے عقیدہ و مذہب کے اعتبار سے زنا کاری اور بدکاری کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ اسلام کی نظر میں پہلی بیوی سے اس کا نکاح باقی نہیں رہا۔

اس پیچیدہ صورت حال میں اگر نومسلم شخص اپنے مذہب اور قانون ملک دونوں کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہتا ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ عملاً تجرد کی زندگی گذارے دوسرے شادی نہ کرے اور پہلی بیوی سے ازدواجی تعلق نہ رکھنے کے باوجود اس کا مالی بوجھ برداشت کرے، میں نہیں سمجھتا کہ اپنے ایک آئینی حق کو استعمال کرنے کی اس سے سخت کوئی سزا ہو سکتی ہے۔

بنیادی حقوق کی پامالی

سپریم کورٹ کے زیر بحث فیصلہ سے دستور ہند کی دفعہ ۲۵ میں دیا ہوا آزادی مذہب کا بنیادی حق بری طرح مجروح ہوا ہے اور اسلام قبول کرنے پر بالواسطہ پابندی عائد کر دی گئی ہے، ورنہ اس کا کوئی عقلی جواز نہیں ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی نومسلم شخص پر ہندو کوڈ بل کا نفاذ کیا جائے اور اسے اپنے مذہب کے مطابق نکاح کا اختیار نہ دیا جائے۔

یکساں سول کوڈ کے مسئلہ کا قانونی اور تاریخی جائزہ

یونیفارم سول کوڈ (یکساں شہری قانون) کا حساس اور نازک مسئلہ دستور ہند سے جڑا ہوا ہے اس لئے سب سے پہلے دستور ہند کی روشنی میں اس مسئلہ کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

آزاد ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی میں خواندگی اور بحث وتمحیص کے بعد موجودہ دستور ہند ۲۹/نومبر ۱۹۴۹ء کو منظور ہوا، کچھ دفعات فوری طور پر نافذ کر دی گئیں اور باقی آئین کے نفاذ کے لئے ۲۶/جنوری ۱۹۵۰ء کی تاریخ طے پائی۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا تقسیم ملک کے نام پر پیدا ہونے والے لرزہ خیز حالات نے ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں سوالیہ نشان لگا دیا۔ برادران وطن کا ذہن یہ تھا کہ جب مسلمانوں نے پاکستان بنوالیا تو اب انہیں ہندوستان میں رہنے کا کیا حق ہے، ہندوستان کے بچے کھچے مسلم قائدین اس کوشش میں شب وروز لگے ہوئے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے پاؤں جم جائیں ان کے دلوں سے خوف وہراس دور ہو۔

ان ہنگامہ خیز غیر معتدل حالات میں دستور ہند مرتب اور منظور ہوا۔

دفعہ ۴۴ دستور ہند میں کس طرح شامل ہوئی

یکساں سول کوڈ کا تصور ہماری جد وجہد آزادی کے دور میں کہیں بھی موجود نہیں تھا، بلکہ اس کے برعکس جمعیۃ علماء ہند نے کانگریس کا ساتھ اسی شرط پر دیا تھا کہ مسلمانوں کو آزادی کے بعد اپنے دینی معاملات شریعت کے مطابق طے کرنے کا اختیار ہوگا اور ان کے پرسنل لا (عائلی قوانین) میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی۔

یونیفارم سول کوڈ کا تصور اچانک ابھر کر اس وقت سامنے آیا جب کہ

آئین ساز اسمبلی ملک کا آئین تیار کرنے میں مصروف تھی۔ اس مرحلہ میں بنیادی حقوق سے متعلق ذیلی کمیٹی کی ۲۸/مارچ ۱۹۴۷ء کی میٹنگ میں مسٹر ایم۔ آر مسانی کی طرف سے ایک تجویز رکھی گئی کہ بنیادی حقوق میں ایک شق یکساں سول کوڈ کی بھی شامل کی جائے جس کا اطلاق بلاتفریق مذہب تمام شہریوں پر ہو پہلے مرحلہ میں کمیٹی کی اکثریت نے یہ تجویز مسترد کردی لیکن ۳۰/مارچ ۱۹۴۷ء کی میٹنگ میں، تجویز پھر پیش ہوئی، اس کے بعد ذیلی کمیٹی نے معمولی اکثریت سے یہ فیصلہ کیا کہ یکساں سول کوڈ کی ایک کلاز سماجی پالیسی کے رہنما اصولوں میں شامل کرلی جائے۔

پارلیمنٹ میں جب دستور ہند کی خواندگی ہوئی اور دفعہ ۴۴ جو یکساں سول کوڈ کو آئینی حیثیت دینے پر مشتمل ہے زیر بحث آئی تو بہت سے مسلم ممبران نے اس کے خلاف آواز اٹھائی، اور دفعہ ۴۴ کے مضر اثرات کو ختم کرنے کے لئے مختلف ترمیمات پیش کیں لیکن یہ ترمیمات منظور نہ ہوسکیں مثلاً محمد اسماعیل صاحب مرحوم کی پیش کردہ بعض ترمیمات یہ ہیں:

(۱) دفعہ ۳۵ میں درج ذیل شق کا اضافہ کردیا جائے ''کسی گروپ یا فرقہ کو اپنے پرسنل لاء سے دستبردار ہونے کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا، اگر اس کے پاس ایسا قانون موجود ہے''۔ (آئین ساز اسمبلی ڈبیٹ جلد ۷ ص ۵۴۰)

(۲) دفعہ ۱۳ کی کلاز (۱) کی سب کلاز (جی) میں یہ نیا سب کلاز جوڑ دیا جائے ''کوئی شخص جس گروپ یا فرقے سے تعلق رکھتا ہو یا اس سے تعلق کا اظہار کرتا ہو اس کے پرسنل لا پر عمل کرنے کی آزادی''۔ (آئین ساز اسمبلی ڈبیٹ جلد ۷ ص ۷۲۱)

طویل بحثوں کے باوجود مسلم ممبران پارلیمنٹ کی پیش کردہ ترمیمات جن کا مقصد پرسنل لا کو دفعہ ۴۴ کی زد سے بچانا تھا منظور نہ ہوسکیں، ترمیم کا مطالبہ کرنے والوں کو ڈاکٹر امبیڈکر نے یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی:

''یہ محض حکومت کو اختیار دیا جارہا ہے جس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مذہبی

شخصی قوانین کو ختم کردینا ضروری ہوگا، خواہ ملک کے مسلمان، عیسائی یا کوئی اور فرقہ اس سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کرے، کسی کو یہ خطرہ نہ ہونا چاہئے کہ صرف اختیار کے مل جانے کی وجہ سے حکومت اس پر عمل کے لئے اصرار کرے گی۔

حکومت کے اختیار عملاً محدود ہوا کرتے ہیں، خواہ لفظی طور پر آپ انہیں کتنا ہی غیر محدود کرلیں۔ کیونکہ حکومت اپنے اختیارات کا استعمال اس طرح نہیں کرسکتی جس کے نتیجہ میں مسلمان بغاوت پر آمادہ ہوجائیں۔ اگر حکومت کسی وقت ایسا کرنے کی سوچے تو اسے فاتر العقل کہنا چاہئے۔''

خلاصہ یہ کہ بہت سے ممبران پارلیمنٹ کی زوردار مخالفت کے باوجود دفعہ ۴۴ بلاکسی ترمیم واضافہ کے منظور کرلی گئی ہے۔ اس طرح ہمارا دستور ایک کھلے ہوئے تضاد کا شکار ہوگیا۔

ایک طرف اس دستور کے حصہ سوم میں بنیادی حقوق کے تحت دفعہ ۲۵ میں لکھا گیا ''تمام اشخاص کو آزادی ضمیر اور آزادی سے مذہب قبول کرنے اس کی کی پیروی اور اس کی تبلیغ کرنے کا مساوی حق ہے بہ شرطیکہ امن عامہ، اخلاق عامہ، صحت عامہ اور اس حصہ کی دیگر توضیحات متاثر نہ ہوں''۔ (ص ۴۶)

دوسری طرف حکومت کو اختیار دیا گیا بلکہ ہدایت دی گئی کہ یکساں سول کوڈ نافذ کرکے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی کو سلب کرے۔

دستور کی دفعہ ۲۵ اور دفعہ ۴۴ میں تضاد

دستور کی ان دو دفعات ۲۵، ۴۴ کا تضاد سمجھنے کے لئے ہمیں کچھ تفصیل سے دستور ہند پر نظر ڈالنی ہوگی۔

دستور ہند بائیس حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں مملکت اور اس کے علاقوں کی تعیین وتفصیل بیان کی گئی ہے، حصہ دوم میں ہندوستانی شہریت کے قوانین بیان کئے گئے ہیں۔

دستور کے حصہ سوم میں ہندوستانی شہریوں کے آئینی حقوق تفصیل سے درج کئے گئے ہیں، دستور ہند کے اس حصہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ بنیادی حقوق کے تحت دفعہ ۱۳ میں تحریر ہے۔

۱۳- (۱) وہ سب قوانین جو اس آئین کی تاریخ نفاذ سے عین قبل بھارت کے علاقہ میں نافذ ہوں، جہاں تک وہ اس حصہ کے متناقض ہوں تناقض کی حدتک باطل ہوں گے۔

(۲) مملکت ایسے قانون نہ بنائے گی جو اس حصہ سے عطا کئے ہوئے حقوق کو چھین لے یا ان میں کمی کرے اور کوئی قانون جو اس فقرہ کی خلاف ورزی میں بنایا جائے خلاف ورزی کی حدتک باطل ہوگا۔

بنیادی حقوق کے اس حصہ میں بہت سے حقوق ہیں مثلاً مساوات کا حق، حق آزادی، آزدیٔ مذہب کا حق، ثقافتی اور تعلیمی حقوق، آئینی چارہ جوئی کا حق وغیرہ۔

دفعہ ۲۵ تا ۲۸ کا تعلق مثبت یا منفی طریقہ پر آزادی مذہب سے ہے دفعہ ۲۵ میں کہا گیا ہے۔

دفعہ ۲۵ (۱) تمام اشخاص کو آزادی ضمیر اور آزادی سے مذہب قبول کرنے اس کی پیروی اور اس کی تبلیغ کرنے کا مساوی حق ہے بہ شرطیکہ امن عامہ، اخلاق عامہ، صحت عامہ اور اس حصہ کی دیگر توضیحات متاثر نہ ہوں۔

(۲) اس دفعہ کا کوئی امر کسی ایسے موجودہ قانون کے نفاذ کو متاثر نہ کرے گا اور نہ وہ ایسے قانون کے بنانے میں مملکت کا مانع ہوگا جو

(الف) کسی معاشی، مالیاتی، سیاسی یا دیگر غیر مذہبی سرگرمی کو جس کا تعلق مذہبی عمل سے ہوسکتا ہو منضبط کرے یا اس پر پابندی لگائے۔

زیر بحث دفعہ ۲۵ میں آزادی مذہب کے حق کو امن عامہ، اخلاق عامہ، اور صحت عامہ کی زنجیروں سے جکڑ کر عدلیہ اور انتظامیہ کو لامحدود اختیارات دے

دیئے گئے ہیں کہ جس مذہبی عمل اور سرگرمی کو چاہیں اخلاق عامہ، امن عامہ، صحت عامہ کے لئے مضرت رساں ہونے کے بہانے روک دیں اور اس پر قانونی پابندی عائد کردیں۔

دستور کا چوتھا حصہ مملکت کی حکمت عملی کے رہنما اصول پر مشتمل ہے اس حصہ کی دفعات کے بارے میں دفعہ ۳۷ میں تحریر ہے۔

اس حصہ کی دفعات کو کوئی عدالت نافذ نہ کر سکے گی لیکن اس کے باوجود وہ اصول جو اس میں قلمبند کئے گئے ہیں مملکت کی حکمرانی کے لئے بنیادی ہیں اور مملکت کا فرض ہوگا کہ قوانین بنانے میں ان اصولوں کا اطلاق کرے۔

دستور کے حصۂ چہارم (دستور کے رہنما اصول) کی دفعہ ۴۴ میں کہا گیا ہے۔

ریاست کوشش کرے گی کہ پورے ملک میں شہریوں کے لئے یکساں شہری قانون ہو۔

اوپر تفصیل سے یہ بات گذر چکی ہے کہ مسلمان ممبران پارلیمنٹ کی شدید تر مخالفتوں کے باوجود یکساں سول کوڈ کی دفعہ (دفعہ ۴۴) مملکت کے رہنما اصولوں میں شامل کرلی گئی۔ آئین ساز اسمبلی میں ایک طاقتور لابی موجود تھی جو مذہب کی عملداری انتہائی محدود کرنے بلکہ اسے ختم کرنے پر تلی ہوئی تھی، زندگی کے دوسرے میدانوں سے مذہب کی عملداری پہلے ہی ختم ہوچکی تھی۔

شریعت ایکٹ کا پس منظر

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ عدلیہ کا پورا ڈھانچہ تبدیل کرکے رکھ دیا۔ ۱۸۶۲ء میں اسلامی تعزیرات کو منسوخ کرکے تعزیرات ہند کا نفاذ عمل میں آیا۔ ۱۹۶۴ء میں زبردست قدم اٹھاتے ہوئے برطانوی حکومت ہند نے مسلمان قاضیوں کی تقرری موقوف کردی۔ ۱۸۶۴ء سے

قبل ہر علاقہ میں حکومت کی طرف سے مسلمان قاضی مقرر کیے جاتے تھے جو مسلمانوں کے خانگی اور عائلی تنازعات میں شریعتِ اسلامی کے مطابق فیصلے دیا کرتے تھے۔ ۱۸۷۲ء میں اسلامی قانونِ شہادت کی حکمرانی عدالتوں سے ختم کردی گئی، اس کی جگہ انسانی ذہنوں کا تراشا ہوا قانونِ شہادت نافذ کیا گیا۔ غرضیکہ ایک ایک کرکے اسلامی قصرِ عدالت کی ساری اینٹیں جدا کرکے پورے عدالتی نظام کو غیر اسلامی خطوط پر استوار کیا گیا اور یہ سب کچھ سنگینوں کی نوک پر اور جبر وتشدد کے سہارے کیا گیا، مسلمانوں کی آہ وفریاد نالہ واحتجاج نے کوئی اثر نہیں کیا۔

انگریزوں نے یہ سب کارروائیاں جوشِ غضب اور جذبۂ انتقام میں کیں۔ انہیں اس بات کا بے پناہ غصہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں نے برطانوی سامراج کا استقبال کرنے کے بجائے قدم قدم پر اس کی شدید مزاحمت کی اور ہندوستان سے انگریزوں کا اقتدار ختم کرنے کے لئے ہر خطرہ مول لیا۔

امتدادِ زمانہ کے ساتھ انگریزوں کے جذبۂ انتقام میں کچھ کمی ہوئی۔ انگریز حکام نے محسوس کیا کہ برطانوی حکومت ہند سے مسلمانوں کی نفرت وعداوت کا سب سے اہم سبب ان کے دینی معاملات میں صریح مداخلت ہے۔ بالآخر مرکزی مجلس قانون ساز کے مسلم اراکین کی تحریک اور کوششوں سے ۱۹۳۷ء میں شریعت ایکٹ منظور ہوا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ”وراثت، نکاح، فسخ نکاح بشمول طلاق، ایلاء، ظہار، لعان، خلع، مبارات، نفقہ، مہر، ثبوتِ نسب، امانت، جائداد، حقِ شفعہ، ہبہ، اوقاف کے معاملات میں مسلمان لازمی طور پر پرسنل لاء کے تابع ہوں گے وصیت اور تبنیت کے معاملات میں مسلم پرسنل لاء کا اطلاق اختیاری ہوگا۔“

شریعت ایکٹ منظور ہونے سے ہندوستان میں اسلام کے عائلی قوانین کو بڑی حد تک تحفظ حاصل ہوا۔

تحریک آزادی اور مسلم پرسنل لا

بیسویں صدی کے ابتدائی دہوں میں پورا ہندوستان تحریکِ آزادی کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ ہندوستان کی تمام قومیں ہندوستان کی آزادی کے لئے جان ومال کی بازی لگا رہی تھی، ہندوستانی مسلمان جدوجہد آزادی کا ہراول دستہ تھے۔ تحریک آزادی میں مسلمان علماء قائدین اور عوام اپنے ملی تناسب آبادی سے کہیں زیادہ حصہ لے رہے تھے۔ کانگریس کے صف اول کے قائدین میں بہت سے علماء اور مسلم رہنما شامل تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کانگریس کے شانہ بشانہ جدوجہد آزادی میں شریک تھی۔ اس لئے آزادی سے پہلے کانگریس نے اپنی متعدد سالانہ کانفرنسوں کی قراردادوں میں مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کے مسئلہ کو شامل کیا۔ مسلمانوں سے صریح وعدہ کیا اور یقین دہانی کرائی کہ آزادی کے بعد مسلم پرسنل لاء کا پورا تحفظ کیا جائے گا اور اس میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

دستورِ ہند اور مسلمان

آزادی کی صبح بڑی قربانیوں اور تمناؤں کے بعد طلوع ہوئی لیکن یہ صبح جس کا مدتوں سے انتظار تھا مسلمانوں کے لئے بڑی بھیانک ثابت ہوئی، تقسیم ملک کے نتیجہ میں نفرت وعداوت کا بادل پورے ملک پر چھا گیا، بے گناہوں کے خون سے ہندوستان کی سرزمین لالہ زار ہوگئی، مسلمانوں نے آزادی کا جو سہانا خواب دیکھا تھا وہ بکھر کر رہ گیا، انہیں حالات میں جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود وبقا پر سوالیہ نشان لگ گیا تھا دستورِ ہند مرتب اور منظور ہوا، ہندوستان میں بچے کھچے مسلم قائدین اس جدوجہد اور فکر میں لگے ہوئے تھے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کے پیر اکھڑ نہ جائیں، دستور ہند کے واضعین نے مذہب، زبان، تہذیب کی آزادی کو بنیادی حقوق میں شامل ضرور کیا لیکن مذہب کی آزادی کا دائرہ کہاں تک ہے اس کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی اور

اس کے دائرہ کا تعین عملاً عدلیہ اور انتظامیہ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا حیرت ہے کہ جس دستورِ ہند میں پسماندہ اقوام اور بعض اقلیتوں کے تعلق سے معمولی جزئیات کی تفصیل موجود ہے اسی دستور میں اقلیتوں کے پرسنل لاء کے تحفظ سے متعلق ایک جملہ بھی موجود نہیں ہے، مسلم اراکینِ پارلیمنٹ نے ایسی بعض دفعات دستور میں شامل کرانے کی کوشش کی لیکن انہیں ناکامی ہوئی۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ دستور میں مسلم اراکین کی مخالفت کے باوجود یکساں سول کوڈ کی دفعہ (دفعہ۴۴) شامل کردی گئی، واضعین دستور نے دفعہ ۴۴ شامل کرکے اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے سروں پر ننگی تلوار لٹکا دی ہے تاکہ جب بھی حالات سازگار ہوں اقلیتوں کے پرسنل لا کا سر قلم کیا جاسکے۔

یکساں سول کوڈ کی تشکیل وتنفیذ کی کوشش

یکساں سول کوڈ کی تدوین وتنفیذ کی دفعہ (دفعہ۴۴) کو دستور میں شامل کرتے وقت قانون ساز اسمبلی میں جو بحثیں ہوئیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ پرسنل لاء کو مذہب سے دائمی طور پر جدا کرنے کے مقصد سے یہ دفعہ دستور میں شامل کی گئی۔ دستوری طور پر پارلیمنٹ کو یکساں سول کوڈ کی تشکیل وتنفیذ کا اختیار دیا گیا بلکہ حکومتِ ہند کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں پوری کوشش کرے۔

حکومتِ ہند اپنی اس ''ذمہ داری'' سے غافل بھی نہیں ہے، مسلم پرسنل لاء کو ختم کرکے یونیفارم سول کوڈ نافذ کرنے کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہے، اپنے کو مسلمان کہنے والے ان تجدد پرستوں کے مہمل خیالات کو ہوا دی جارہی ہے جو اسلام کے عائلی قوانین میں اصلاح اور تبدیلی کا مطالبہ کررہے ہیں، مغرب پرست مسلم خواتین کی تنظیمیں قائم کراکے مسلم پرسنل لاء کو عورتوں کے حق میں ظلمِ عظیم ثابت کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ اس بات کی برابر کوشش جاری ہے کہ مسلمانانِ ہند کا ایک معتد بہ طبقہ مسلم پرسنل لا کو ختم کرکے یکساں سول کوڈ نافذ

کرنے کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑا ہوتا کہ یہ کہا جاسکے کہ ہم نے خود مسلمانوں کے مطالبہ پر یہ اقدام کیا ہے۔ ہمارا قومی پریس اسلام کے عائلی قوانین کو ہدف بنانے والے واہی تباہی مضامین کو شاہ سرخیوں میں جگہ دیتا ہے اور اسلامی قوانین کی حمایت میں لکھے گئے فاضلانہ مضامین اور مراسلوں کو کسی گوشہ میں بھی شائع کرنے کا روادار نہیں۔

دستور ہند میں اس بات کی صراحت کردی گئی ہے کہ ''رہنما اصول'' کی دفعات عدالتوں کے ذریعہ قابلِ نفاذ نہیں، اس کے باوجود شاہ بانو کیس کے فیصلہ (۱۹۸۵ء) سے لے کر سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ (مئی ۱۹۹۵ء) تک عدالتِ عالیہ کے معزز جج صاحبان اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے دفعہ۴۴ کے نفاذ پر مسلسل اصرار کررہے ہیں اور اپنے تہلکہ خیز فیصلوں کے ذریعہ حکومت کو یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے لئے مہمیز کرتے رہتے ہیں۔

مذہبی آزادی اور مذہبی عمل کی تشریح

مذہبی آزادی اور مذہبی عمل کی تشریح وتعبیر میں سپریم کورٹ کے مختلف فیصلوں کا جائزہ بہت سے چونکا دینے والے حقائق کا انکشاف کرتا ہے۔ ہندوؤں کی طرف سے دائر مقدمات میں وہ سارے کام مذہبی عمل قرار دیئے جاتے ہیں جنہیں برادران وطن مذہبی عمل شمار کرنا چاہیں حتی کہ مختلف یاترائیں نکالنا اور متنازعہ مقامات پر کسی بھی مذہبی عنوان سے لاکھوں کا مجمع اکٹھا کرنا مذہبی عمل قرار پاتا ہے خواہ ان کی اجازت دینے سے پورے ملک کا امن وامان درہم برہم ہوجائے اور شدید خونریزی کا خطرہ ہو، اس کے برخلاف اگر عدالتِ عالیہ میں مسلمانوں کا معاملہ زیرِ بحث ہوتو مذہبی آزادی اور مذہبی عمل کا دائرہ انتہائی محدود ہوجاتا ہے، نکاح وطلاق وغیرہ کے معاملات کو مذہبی عمل میں داخل کرنا قابل غور ہوجاتا ہے، غرضیکہ مذہبی آزادی اور مذہب پر عمل کی تشریح میں عدالتِ عالیہ کے

بہت سے فاضل جج صاحبان کے پاس دو پیمانے ہیں اکثریت کے لئے ایک پیمانہ اور اقلیت کے لئے دوسرا پیمانہ۔

یکساں سول کوڈ اور مسلمان

ملک کی آزادی کے بعد (انتہائی مختصر مدت کو چھوڑ کر) مرکز میں کانگریس کی حکومت رہی۔ آزادی کے چند سال بعد ہندو قوم کے لئے مختلف عائلی قوانین پارلیمنٹ میں منظور کئے گئے جو ہندو کوڈ بل کے نام سے مشہور ہوئے، ہندو کوڈ بل کو بہت سے مذہبی ہندوؤں نے پسند نہیں کیا اور اسے مذہب میں مداخلت قرار دیا لیکن سیاسی رہنماؤں نے ہندو اراکین پارلیمنٹ کو یہ ذہنی رشوت دی کہ ہندو کوڈ بل کی منظوری یکساں سول کوڈ کے لئے مضبوط قدم ہے جب ہندو قوم پارلیمنٹ کے ذریعہ منظور شدہ عائلی قوانین قبول کرلے گی تو مسلم پرسنل لا کو ختم کرنا اور یکساں شہری قانون کو نافذ کرنا انتہائی آسان ہو جائے گا۔ حکومت کے ذمہ داروں کی طرف سے وقتاً فوقتاً یہ باتیں کہی جاتی رہیں اور مسلمانوں کو کبھی دھمکا کر اور کبھی نرم لہجہ میں یکساں سول کوڈ کو قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوششیں جاری رہیں۔

جب ہندو پرسنل لاء کو نئی شکل دی جارہی تھی اس وقت کے مرکزی وزیر قانون مسٹر پاٹکر نے کہا تھا ''ہم نے اپنے آئین کے نفاذ (۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء) کے بعد اسپیشل میرج ایکٹ، ہندو میرج ایکٹ پاس کیے ہیں اب ہندو قانونِ وراثت کا مسودہ پارلیمنٹ میں زیرِ غور ہے یہ سب ضابطۂ دیوانی یکساں بنانے کے اقدامات ہیں''۔ (۲۵ راگست ۱۹۵۵ء کی ریڈیائی تقریر)

۱۹۶۳ء میں حکومت نے ایک کمیشن مقرر کرنا چاہا تھا جس کا مقصد مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی پر غور وفکر اور اس کے لئے عملی راہوں کو تلاش کرنا تھا، مسلمانوں کی ہمہ گیر مخالفت کے نتیجہ میں یہ کمیشن مقرر نہیں کیا گیا اور وزیر قانون

نے پارلیمنٹ میں یہ کہہ کر بحث ختم کردی کہ حکومت اس وقت مسلم پرسنل لاء میں کوئی ترمیم کرنا مناسب نہیں سمجھتی۔

۱۹۷۳ء میں مرکزی وزیر قانون مسٹر گوکھلے نے متبنیٰ بل کو پیش کرتے ہوئے پارلیمنٹ میں کہا، یہ مسودۂ قانون یونیفارم سول کوڈ کی طرف ایک مضبوط قدم ہے۔

مارچ ۱۹۷۳ء میں گوجندر گڈکر (چیرمین لا کمیشن) نے کہا تھا:

''مسلمانوں کو یونیفارم سول کوڈ قبول کرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کرلینا چاہئے اگر انہوں نے خوش دلی کے ساتھ یہ تجویز منظور نہیں کی تو قوت کے ذریعہ نافذ کیا جائے گا''۔

حکومت کی طرف سے یکساں سول کوڈ کے لئے فضا ہموار کرنے، خصوصاً مسلمانوں کو مسلم پرسنل لا سے دستبرداری پر آمادہ کرنے کے لئے کوششیں برابر جاری رہیں، مسلمانوں کی نبض ٹٹولنے اور ان کے سیاسی موڈ کا اندازہ لگانے کے لئے بہت تھوڑے تھوڑے عرصہ میں یکساں سول کوڈ کا شوشہ چھوڑا جاتا رہا اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ سپریم کورٹ کا زیر بحث فیصلہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

ہندو عائلی قوانین میں اصلاح کا مقصد

یہ کہنا بہت بڑی فریب دہی ہے کہ ہندو قوم ملک کی یکجہتی اور قانون میں یکسانیت لانے کے لئے اپنے عائلی قوانین (پرسنل لاء) میں تبدیلی واصلاح پر آمادہ ہوئی اور اس نے ملک کے مفاد کے لئے اپنے مذہبی جذبات کی قربانی دی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندو مذہب میں انسانی فطرت سے میل کھاتے ہوئے قابلِ عمل عائلی قوانین موجود ہی نہیں تھے۔ ہندوؤں کی مختلف قوموں اور ان کے مختلف خطوں میں شادی بیاہ وغیرہ کے تعلق سے الگ الگ رسم ورواج تھے اور یہ رسم ورواج انتہائی متضاد اور مختلف تھے۔ بیوہ عورتوں کو دوسری شادی کا حق نہیں تھا، ان

کے لئے کمال کی بات یہ تھی کہ اپنے متوفی شوہر کی چتا میں جل کر راکھ ہو جائیں اور اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کریں، میاں بیوی کے تعلقات خواہ کتنے ہی کشیدہ ہو جائیں ہندو رسم و رواج میں طلاق کی گنجائش نہیں تھی۔ میراث وغیرہ کے بارے میں بھی ہندو مذہب کے قوانین انتہائی غیر عادلانہ تھے اس صورتِ حال نے ہندو قوم کے قائدین کو مجبور کیا کہ وہ غیر فطری اور ظالمانہ رسم و رواج کو ختم کرنے کے لئے پارلیمنٹ کے ذریعہ ہندو کوڈ بل پاس کرائیں، ہندو کوڈ بل دیوانی قوانین میں یکسانیت لانے کے لئے ہرگز منظور نہیں کیا گیا ورنہ اسپیشل میرج ایکٹ کے بعد ہندو میرج ایکٹ (۱۹۵۵ء) منظور کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں خود ہندو کوڈ بل کی مختلف دفعات میں بہت سے معاملات کو رسم و رواج پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں قانون میں یکسانیت کہاں پیدا ہوئی۔ (ملاحظہ ہو ہندو میرج ایکٹ کی دفعہ (۱)۱۷ اور (۲)۱۷)

چور دروازوں سے مسلم پرسنل لا میں مداخلت

ابھی تک مسلم پرسنل لا کو ختم کرنے کا راست اقدام نہیں کیا جا سکا ہے لیکن مختلف چور دروازوں سے اس پر نقب لگائی جاتی رہی ہے، پارلیمنٹ اور مختلف صوبائی اسمبلیوں نے ایسے مختلف قوانین منظور کئے ہیں جن کی زد اسلام کے عائلی قوانین پر پڑتی ہے، تعزیراتِ ہند میں بھی ایسی متعدد دفعات شامل کی گئی ہیں جن سے مسلم پرسنل لاء کا نفاذ بری طرح مجروح اور متأثر ہوا ہے اسی طرح سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس کے بہت سے فیصلے بھی مسلم پرسنل لاء میں دخل انداز ہوئے ہیں، افسوس ہے کہ اب تک ہمارے پاس ان قوانین اور فیصلوں کی مکمل فہرست بھی نہیں ہے جن سے پرسنل لاء کے مختلف حصے مجروح ہوئے ہیں، بہت سے قوانین انتہائی خاموشی سے پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں پاس ہو جاتے ہیں اور ہمارے مسلم اراکین پارلیمنٹ کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس قانون کی زد

کہاں پڑ سکتی ہے۔ جب عدالتوں کے ذریعہ ان قوانین کے مطابق فیصلہ ہوتا ہے اور شاہ بانو کیس جیسی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو ہمارے کان کھڑے ہوتے ہیں اور ہم آنکھ ملتے ہوئے مقابلہ کی تیاری شروع کرتے ہیں۔

یکساں سول کوڈ اور بھاجپائی حکومتیں

جسٹس کلدیپ سنگھ کے حالیہ فیصلہ کے بعد یونیفارم سول کوڈ کا مسئلہ پھر بحث و مباحثہ کا موضوع بن گیا ہے، قومی پریس میں اسلام کے عائلی قوانین کے خلاف انتہائی زہر افشانی کی جا رہی ہے، طبقۂ نسواں کے تعلق سے مسلم سماج کی تصویر انتہائی مسخ کر کے پیش کی جا رہی ہے اور مسلم خواتین کے حالِ زار پر آنسو بہائے جا رہے ہیں، بھارتیہ جنتا پارٹی نے خاص طور پر اس مسئلہ کو ہوا دی ہے اور اسے اپنا انتخابی ایشو بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یونیفارم سول کوڈ کے مسئلہ پر بھاجپائی قائدین اور وزراء اعلیٰ کی کئی میٹنگیں ہو چکی ہیں انہوں نے مرکز پر زور دیا ہے کہ سپریم کورٹ کی ہدایت کے مطابق جلد از جلد یکساں سول کوڈ مدون اور نافذ کرے، بھاجپا نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ اگر مرکز نے اس مسئلہ کے بارے میں سرد مہری کا ثبوت دیا تو جن صوبوں میں بھاجپا یا اس کی حلیف پارٹیوں کی حکومت ہے وہاں یکساں سول کوڈ جلد از جلد نافذ کیا جائے گا۔ (گجرات، دہلی، راجستھان، مہاراشٹر)

کیا صوبائی حکومتیں مسلم پرسنل لا میں مداخلت کر سکتی ہیں؟

بھاجپا کے اس عزم اور فیصلہ پر بہت سے لوگوں کو حیرت ہے کہ کیونکہ دفعہ ۴۴ کی مخاطب مرکزی حکومت ہے اس کی رو سے مرکزی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ملک کے تمام شہریوں کے لئے یکساں سول کوڈ مدون کرنے اور نافذ کرنے کی کوشش کرے، دفعہ ۴۴ کے اعتبار سے یونیفارم سول کوڈ کی تدوین

وتنفیذ کی ذمہ داری مرکزی حکومت پر عائد ہوتی ہے، صوبے اس کے مخاطب اور مجاز نہیں لیکن بھاجپا کے اس فیصلے پر استعجاب دستورِ ہند کے ناقص مطالعہ پر مبنی ہے، صورت حال یہ ہے کہ قانون سازی کے تعلق سے دستورِ ہند میں تین فہرستیں درج ہیں فہرست ۱ میں وہ امور گنائے گئے ہیں جن کے بارے میں قانون سازی کا اختیار صرف مرکزی حکومت کو ہے، فہرست ۲ میں وہ امور درج ہیں جن کے بارے میں قانون سازی کا اختیار صرف ریاستی حکومت کو ہے اور فہرست ۳ میں ان امور کا اندراج ہے جن کے بارے میں قانون سازی کا اختیار مرکزی حکومت کو بھی ہے اور صوبائی حکومتوں کو بھی، ان امور میں پرسنل لا کے مسائل بھی ہیں چنانچہ فہرست ۳ میں شامل پانچواں امر یہ ہے، دفعہ ۵، بیاہ وطلاق، اطفال اور نابالغان، وصیتیں، وفات بلا وصیت اور وراثت خاندان مشترکہ اور بٹوارہ سب امور جن کے متعلق عدالتی کارروائی کے فریق اس آئین کی تاریخِ نفاذ کے عین قبل اپنے شخصی قانون کے تابع تھے۔ (بھارت کا آئین ص ۳۵۷)

غرضیکہ پرسنل لاء کے مسائل میں قانون سازی کا اختیار مرکز اور صوبوں دونوں کو ہے اس لئے اگر مختلف صوبوں کی بھاجپائی حکومتیں مسلم پرسنل لاء کو ختم کرنے کے لئے اپنے صوبوں میں یکساں عائلی قوانین نافذ کریں تو ان کے لئے کوئی بڑی دستوری رکاوٹ موجود نہیں ہے۔ بہت سے بہت یہ ہوگا کہ شریعت اپلیکیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء (جو ایک مرکزی قانون ہے) سے صوبائی قوانین کا ٹکراؤ ہوگا، ایسی صورت میں مرکزی حکومت اگر سنجیدگی سے اس پر کوئی ایکشن لینے کو تیار ہوگی تب تو ان صوبائی قوانین کی راہ میں کچھ قانونی رکاوٹ پیدا ہوسکتی ہے لیکن اگر مرکزی حکومت نے خاموشی اختیار کی تو تنہا مسلمانوں کی چارہ جوئی سے ان صوبائی قوانین کو ختم کرانا انتہائی مشکل ہوگا۔ بنیادی حقوق کی دفعہ ۲۵ (جس میں اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے اور اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی آزادی دی گئی ہے) کس حد تک ان بھاجپائی صوبائی حکومتوں کے عزائم میں حائل ہوسکتی ہے یہ

سمجھنا ان لوگوں کے لئے مشکل نہیں ہے جو سپریم کورٹ کے مختلف فیصلوں پر نگاہ رکھتے ہیں اور مسلم پرسنل لا کے بارے میں عدالت ہائے عالیہ کے اکثر جج صاحبان کا موڈ سمجھتے ہیں۔

اوپر کے صفحات میں یہ جائزہ پیش کیا گیا کہ موجودہ ہندوستان میں اسلام کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لاء) اور اسلامی تشخص کو کیا خطرات درپیش ہیں، دستور ہند کی آڑ میں اسلام کے معاشرتی اور عائلی قوانین کو سبوتاژ کرنے کے لئے کس قدر منظم اور مسلسل کوششیں ہورہی ہیں، اور دستور ہند مسلم پرسنل لاء کو کس حد تک تحفظ فراہم کرتا ہے۔

جدوجہد کے چار میدان

اگلے صفحات میں ہمیں روشنی ڈالنا ہے کہ مسلم پرسنل لاء اور اسلامی تشخص کو درپیش خطرات کے سد باب کے لئے مسلمانان ہند کو کیا کیا اقدامات کرنے چاہئیں۔ اس سلسلہ میں میری رائے میں چار محاذوں پر مسلسل جدوجہد ضروری ہے۔

۱- دستوری اور قانونی جدوجہد

دفعہ ۴۴ کی منسوخی کے لئے جدوجہد

یہ بات پوری تفصیل سے لکھی جاچکی ہے کہ دستور ہند کی دفعہ ۴۴ (یونیفارم سول کوڈ کی دفعہ) مسلم پرسنل لا اور تمام اقلیتوں کے پرسنل لاز کے لئے لٹکتی ہوئی تلوار ہے جب تک دفعہ ۴۴ موجودہ شکل میں برقرار ہے ہندوستان میں اسلام کے عائلی قوانین سنگین خطرے سے دوچار ہیں، ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ پارلیمنٹ میں دفعہ ۴۴ کا جادو جگا کر مسلم پرسنل لا کو نیست ونابود کردیا جائے، اس لئے سب سے ضروری اور فوری کام یہ ہے کہ دفعہ ۴۴ کو دستور سے خارج کرانے یا اس سے اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کو مستثنیٰ کئے جانے کی پرزور سیاسی اور آئینی جد

وجہد کی جائے۔مسلمانوں کے سیاسی مطالبات میں دفعہ ۴۴ کی منسوخی کو سرفہرست جگہ ملنی چاہئے، اس مطالبے پر زور دینے کے لئے اس مسئلہ پر مسلمانوں کی رائے عامہ بیدار کی جانی چاہئے اور برادران وطن پر یہ حقیقت واضح کی جانی چاہئے کہ دفعہ ۴۴ کی منسوخی خود ملک اور وطن کے مفاد میں ہے۔

یکساں سول کوڈ اور اقلیتیں

یکساں سول کوڈ کا شوشہ بار بار چھوڑنے سے صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ملک کی دوسری اقلیتیں بھی مضطرب اور فکرمند ہیں۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۹۵ء کو امرتسر میں منعقدہ عالمی سکھ کانفرنس میں سکھوں کے علاحدہ پرسنل لاء پر زور دیا گیا اور کانفرنس نے یکساں سول کوڈ کو تسلیم نہ کرنے کا اعلان کیا۔ (قومی آواز لکھنؤ ۲۵ ستمبر ۱۹۹۵ء)

ہندوستان میں آباد عیسائی (کرسچین) بھی اپنے علاحدہ پرسنل لا کو مرتب اور منظور کرانے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں۔ یونیفارم سول کوڈ انہیں بھی تسلیم نہیں۔ بدھسٹوں کی طرف سے بھی اسی قسم کی آواز اٹھ چکی ہے۔ بہت سے ہندو قبائل بھی یکساں سول کوڈ کے سیلاب میں بہنے کو تیار نہیں، انہیں اپنے قبائلی رسم ورواج اور طریقۂ زندگی پر حد درجہ اصرا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یکساں سول کوڈ مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کی دوسری مذہبی اور تہذیبی اقلیتوں کو بھی منظور نہیں۔ خود ہندوؤں کے بہت سے فرقے اور قبائل بھی اسے مسترد کرتے ہیں۔

اسی طرح ہندوؤں کے بہت سے اہل فکر ودانش یکساں سول کوڈ کے نعرہ کو بے وقت کی راگنی اور بے فائدہ عمل تصور کرتے ہیں۔ یہ تو ہمارے قومی پریس کی سحر کاری ہے کہ اس نے یونیفارم سول کوڈ کے مطالبہ کو پوری قوم کا مطالبہ بنا کر پیش کیا ہے حالانکہ درحقیقت اس کے حامی بہت اقلیت میں ہیں، ہندوؤں کا ایک بہت مختصر اور جارح طبقہ ہی یکساں سول کوڈ کا داعی اور مناد ہے۔

اس لئے اگر دفعہ ۴۴ کی منسوخی کے لئے سنجیدہ اور منظّم جدوجہد کی جائے تو اس کے لئے رائے عامہ ہموار کرنا کوئی دشوارتر کام نہیں، ظاہر ہے کہ یہ کام آناً فاناً نہیں ہوسکتا ہے بلکہ اس کے لئے بڑی ہوشمندی اور حکمتِ عملی سے طویل جدوجہد کرنی ہوگی، ان تمام اقلیتوں اور مذہبی اور تہذیبی اکائیوں کو ساتھ لینا ہوگا جو یکساں سول کوڈ کو اپنے مذہب اور ثقافت کے لئے خطرہ تصور کرتی ہیں، افہام وتفہیم اور مذاکرات سے ہندو اہل سیاست اور اہل فکر ودانش کو بھی اس بات کا قائل بنانا ہوگا کہ یکساں سول کوڈ پر اصرار ملک کے لئے مفید نہیں بلکہ انتہائی ضرر رساں ہے۔ یکساں سول کوڈ کی جنگ چھیڑنے سے ہندوستانی قوم کی بہترین دماغی صلاحیتیں ملک کی تعمیر میں صرف ہونے کے بجائے بری طرح ضائع ہوں گی۔ باشندگانِ ملک کا ایک بڑا طبقہ اضطراب اور کشمکش میں مبتلا ہوگا اور ملک کی سیاست اور معیشت پر اس کے برے اثرات مرتب ہوں گے۔

یکساں سول کوڈ اور قومی یک جہتی

یکساں سول کوڈ کے حامیوں کی یہ فرسودہ دلیل اپنا وزن کھو چکی ہے کہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ سے ملک میں اتحاد اور یک جہتی کو فروغ ہوگا، ظاہر ہے کہ جو قانون کروڑوں انسانوں کے مذہبی عقائد اور دینی جذبات کو بھینٹ چڑھا کر طاقت کے نشہ میں نافذ کیا جائے گا۔ اس کے ذریعہ ملک میں نفرت اور عداوت کی کاشت ہی ہوگی۔ ایسے قانون کے ذریعہ اتحاد ویک جہتی کو فروغ ہونے کے بجائے تفرقہ بندی اور بدامنی ہی کو فروغ ہوگا، اس لئے یہ کہنا بڑی بے عقلی اور ہٹ دھرمی کی بات ہے کہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ سے قومی یک جہتی پیدا ہوگی۔

قانون اور طاقت کے زور پر یکساں شہری قانون (یونیفارم سول کوڈ) مرتب کرکے اسے نافذ کرنے کی بات کرنے والے اس حقیقت

واقعہ کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ملک کے بعض سرحدی صوبوں (مثلاً ناگالینڈ، میزوروم وغیرہ) میں ملک کی آزادی کو ایک مدت گذرنے کے بعد اس وقت حالات پر قابو پایا جاسکا جب ملک کے دستور میں ان علاقوں کے باشندوں کو خصوصی تحفظات فراہم کئے گئے، ان کے مذہبی اور قبائلی رسم ورواج عدالتی سسٹم وغیرہ کو دستوری ضمانت دی گئی، بلکہ مرکزی پارلیمنٹ کی بالادستی کو قربان کرتے ہوئے دستور ہند میں یہ بات بھی شامل کرلی گئی کہ پارلیمنٹ کا پاس کردہ کوئی قانون جو فلاں فلاں امور سے متعلق ہو وہاں اس وقت تک نافذ نہیں ہوسکتا جب تک کہ علاقائی یا صوبائی اسمبلی اس کی توثیق نہ کردے۔

مثلاً ریاست ناگالینڈ کے بارے میں دستور کے حصہ ۲۱ میں دفعہ ۳۷۱ (الف) اس طرح ہے:

دفعہ ۳۷۱-الف-(۱) اس آئین میں کسی امر کے باوجود

(الف) پارلیمنٹ کے کسی ایسے ایکٹ کا اطلاق جو

(۱) ناگاؤں کی مذہبی یا سماجی رسوم

(۲) ناگاؤں کے رواجی قانون

(۳) اور ضابطۂ دیوانی اور فوجداری عدل گستری، جس میں ناگاؤں کے رواجی قانون کے مطابق فیصلے شامل ہیں۔

(۴) اراضی اور اس کے ذرائع ووسائل کی ملکیت اور انتقال سے متعلق ہو۔

ریاست ناگالینڈ پر نہ ہوگا بغیر اس کے کہ ناگالینڈ کی قانون ساز اسمبلی قرارداد کے ذریعہ ایسا فیصلہ کرے (بھارت کا آئین (جنوری ۲۰۰۱ء تک ترمیم شدہ) ص ۳۷۰-۳۷۱)

میزورم کے بارے میں بھی اسی طرح کی خصوصی دفعہ وضع کرکے دستور ہند میں شامل کی گئی، چنانچہ دستور ہند کی دفعہ ۳۷۱ (ز) اس طرح ہے۔

۳۷۱ (ز) اس آئین میں کسی امر کے باوجود

الف - امور مندرجہ ذیل کے متعلق پارلیمنٹ کا کوئی ایکٹ میزورم ریاست کو تب تک لاگو نہیں ہوگا جب تک میزورم ریاست کی قانون ساز اسمبلی کی قرارداد کے ذریعہ اس طرح طے نہیں کیا جاتا ہے۔ یعنی

(i) میزو لوگوں کی مذہبی یا سماجی رسوم

(ii) میزو روایتی قانون اور ضابطہ

(iii) سول اور فوجداری انصرام جہاں فیصلے میزو روایتی قانون کے مطابق ہوتے ہیں۔

(iv) ملکیت اور انتقال اراضی

بشرطیکہ اس فقرہ کی کوئی بات آئین (ترپنویں ترمیم) ایکٹ ۱۹۸۶ کی تاریخ نفاذ سے ٹھیک پہلے میزورم یونین ریاستی علاقہ میں نافذ کسی مرکزی ایکٹ کو لاگو نہیں ہوگی۔

(بھارت کا آئین ص ۳۲۷-۳۲۸، شائع کردہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۲۰۰۱ء)

اقلیتوں خصوصاً مسلم اقلیت کے پرسنل لاز (عائلی شرعی قوانین) کو پامال کرنے کی کوشش خواہ عدلیہ کی طرف سے ہو یا مقننہ اور انتظامیہ کی طرف سے ملک کے مفاد میں نہیں ہے، ان اقدامات سے قومی یک جہتی کے بجائے منافرت کو فروغ ہوتا ہے، اور ملک کی کسی چھوٹی سے چھوٹی اقلیت کو بھی فکر واضطراب میں مبتلا کرکے اور اس کے مذہبی جذبات واحساسات کو مجروح کرکے ملک ترقی نہیں کرسکتا۔

ایک ناگزیر عمل

دفعہ ۴۴ کی منسوخی یا اس میں استثناء کی مہم ایک ناگزیر عمل ہے جسے ہر

قیمت پر انجام دیا جانا چاہئے، خواہ اس کے لئے کتنی ہی طویل اور صبر آزما جد وجہد کرنی پڑے۔ دستور ہند کے مرتب اور منظور ہونے کے بعد اس میں سو سے زائد بار تبدیلیاں ہو چکی ہیں لہذا اگر ہندوستان کی مذہبی اور تہذیبی اقلیتیں اور ہندوؤں کے مختلف قبائل اور فرقے جو یکساں سول کوڈ کے نظریاتی طور پر مخالف ہیں متحد ہو کر دفعہ ۴۴ کی منسوخی یا اس میں ترمیم و استثناء کے لئے منصوبہ بند اور منظّم جد وجہد کریں تو اس میں کامیابی کوئی مشکل عمل نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندوں میں یکساں سول کوڈ کے حامی بہت اقلیت میں ہیں لیکن ذرائع ابلاغ پر کنٹرول کی وجہ سے انہوں نے یہ تأثر پیدا کر دیا ہے کہ ہندوستان کی غالب اکثریت یونیفارم سول کوڈ کے حق میں ہے۔ یکساں سول کوڈ کی مخالفت میں اگر لاکھوں کا مجمع ہو جائے تو بھی اسے ہمارا قومی پریس کوئی اہمیت نہیں دیتا، اگر بڑی سیر چشمی کا مظاہرہ کیا تو اخبار کے کسی گوشہ میں مختصر سی خبر دیدی کہ چند سو قدامت پرست یکساں سول کوڈ کی مخالفت میں جمع ہو جائے، اس کے برخلاف اگر چند نام نہاد ''ترقی پسندوں'' نے یکساں سول کوڈ کی حمایت اور وکالت میں کوئی جلسہ یا سمپوزیم کیا جس میں بہ مشکل چند درجن لوگ شریک ہوئے تو ہمارا قومی پریس اس کی خبروں کو شاہ سرخیوں میں جگہ دیتا ہے۔ انگریزی اور ہندی کے بڑے اخبارات کے کئی کئی کالم اور صفحات اس کے لئے وقف کر دئے جاتے ہیں۔

پرسنل لاز کو دستوری تحفظ دینے کا مطالبہ

میرا خیال یہ ہے کہ اقلیتوں کے پرسنل لاز کی حفاظت کے لئے محض دفعہ ۴۴ کی منسوخی بھی کافی نہیں ہے بلکہ دستور کے بنیادی حقوق کی دفعات میں کسی مناسب جگہ پر مسلم پرسنل لا اور دوسری اقلیتوں کے پرسنل لاز کی حفاظت کی دفعہ بھی شامل کی جانی چاہئے تاکہ چور دروازوں سے مسلم پرسنل لاء وغیرہ میں

مداخلت کا سلسلہ بند ہو، صورت حال یہ ہے کہ آزادی کے بعد مرکزی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں نے مختلف قوانین منظور کر کے دانستہ یا نادانستہ طور پر مسلم پرسنل لا میں مداخلت کی ہے، کریمنل لا (قانون تعزیرات) کی مختلف توضیعات سے اسلام کے عائلی قوانین پر زد پڑتی ہے، یوپی کے خاتمۂ زمینداری ایکٹ نے عورتوں کو زرعی زمینوں میں وراثت پانے سے محروم کر رکھا ہے۔

دستور ہند میں دئے ہوئے حق قانون سازی کے مطابق پرسنل لا کے دائرہ میں شامل امور (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ) کے بارے میں قانون سازی کا اختیار مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت دونوں کو ہے۔ ملاحظہ ہو دستور ہند کی دفعہ ۲۴۶ فہرست ۳ کا نمبر ۵

اسی حق قانون سازی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بی جے پی نے اعلان کیا ہے کہ جن صوبوں میں وہ برسر اقتدار ہے وہاں قانون سازی کر کے یکساں سول کوڈ نافذ کرے گی۔ مہاراشٹر میں برسر اقتدار شیوسینا، بھاجپا سرکار نے انتہائی تیز رفتاری سے دو ایسے بل پاس بھی کر دئے جن کی زد براہ راست مسلم پرسنل لا پر پڑتی ہے۔ اس لئے اگر صرف دفعہ ۴۴ کی منسوخی اکتفا کیا گیا اور بنیادی حقوق کی دفعات میں پرسنل لا کے تحفظ کی دفعہ شامل نہیں کی گئی تو دستور کی دفعہ ۲۴۶ میں دئے گئے حق قانون سازی کا سہارا لے کر مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتیں اسلام کے عائلی قوانین میں مداخلت کا سلسلہ جاری رکھیں گی۔

مجوزہ قوانین کا جائزہ

مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لئے دستوری اور قانونی جد وجہد کا ایک اہم حصہ یہ بھی ہے کہ مرکزی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں پیش کئے جانے والے مجوزہ مجموعۂ قوانین کا ہمارے ماہرین قانون اور علماء پوری بیدار مغزی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہیں۔ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں جو مجموعۂ قوانین

پیش ہونے والے ہوں یا زیر بحث ہوں، ان کی جو دفعات براہ راست یا بالواسطہ اسلام کے عائلی قوانین کو متأثر کرتی ہوں، ان کا فوری طور پر نوٹس لیں اور قانون سازی کے مرحلے میں ایسی دفعات کو رکوانے کی کوشش کریں۔ قانون سازی کے مرحلے میں قانون میں اصلاح وترمیم آسان ہوتی ہے۔ اور قانون پاس ہونے، اس پر ایک عرصہ گذرنے کے بعد اس میں تبدیلی کرنا انتہائی دشوار کام ہوتا ہے۔ دار السلطنت دہلی میں اور ہر صوبے کے صدر مقام پر ماہرین قانون اور علماء پر مشتمل ایسی قانونی کمیٹی ہونی چاہئے جو قانون سازی کے عمل پر برابر نگاہ رکھے اور اس سلسلہ میں ضروری اقدامات کرے۔

اس سلسلے میں اب تک ہم سے کافی کوتاہی ہوئی۔ ابھی تک ہمارے پاس کوئی ایسی مکمل جائزہ رپورٹ بھی نہیں ہے جس سے واضح ہو سکے کہ کن مرکزی اور صوبائی قوانین سے مسلم پرسنل لاء میں مداخلت ہوئی اور شریعت ایکٹ (۱۹۳۷ء) متاثر ہوا۔ ہماری اسی غفلت اور بے خبری کی وجہ سے شاہ بانو کیس جیسے پہاڑ ہمارے اوپر ٹوٹتے ہیں اور اس کی تلافی بہت مہنگی پڑتی ہے۔

۲- علمی وفکری محاذ (اسلام کے عائلی قوانین کی برتری)

اسلامی قوانین کے خلاف جنگ جاری ہے

اس وقت نیشنل پریس سے لے کر سپریم کورٹ تک میں اسلام کے عائلی قوانین کے خلاف جنگ جاری ہے، ارون شوری جیسے بے شمار صحافت کے سورما یہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی تک کا زور لگائے ہوئے ہیں کہ اسلامی قوانین دورِ وحشت کی یادگار ہیں، اسلام کے عائلی قوانین عورتوں کے لئے بڑے ظالمانہ اور جابرانہ ہیں۔ سپریم کورٹ میں مسلم پرسنل لاء کے خلاف متعدد مقدمات درج ہیں جن میں کلی یا جزوی طور پر مسلم پرسنل لاء کو چیلنج کیا گیا ہے، ان میں سے بیشتر مقدمات مسلم خواتین کی طرف سے درج کرائے گئے ہیں۔ اسلام کے عائلی قوانین کے خلاف یہ جنگ ہندوستان تک محدود نہیں ہے بلکہ پورے عالم میں حتی

کہ مسلم ممالک میں بھی یہ جنگ برپا ہے، اسلام کی تصویر مسخ کرنے میں تمام اسلام دشمن طاقتیں برابر کی شریک ہیں، یہ مہم اتنی زور وشور سے چلائی جارہی ہے کہ غیر مسلموں کے علاوہ بہت سے مسلم نوجوان بھی اسلام کے عائلی قوانین کے بارے میں شک اور بے اعتمادی میں مبتلا ہیں اور اسلامی قوانین میں ترمیم واصلاح کا مطالبہ کررہے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ

دوسرا رخ یہ ہے کہ اسلامی شریعت اور اسلامی قوانین کے خلاف برپا اس محاذ آرائی نے بہت سے انصاف پسند غیر مسلم مرد وخواتین میں اسلام کے مطالعہ کا رجحان پیدا کیا ہے، بہت سے غیر مسلم دانشور اور اسکالر اسلام کے قوانین وتعلیمات کا معروضی مطالعہ کرکے اسلام سے بہت قریب آئے ہیں، ان میں سے بہت سوں نے اسلام قبول کرلیا ہے، ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق یورپ کی عورتوں میں قبولِ اسلام کا رجحان مردوں سے کہیں زیادہ ہے، حالانکہ یہ پروپیگنڈہ مسلسل کیا جارہا ہے کہ اسلام عورت کو گری ہوئی نگاہ سے دیکھتا ہے، عورت کو سماج میں باعزت مقام نہیں دیتا، اور ان پر ہر طرح کا ظلم روا رکھتا ہے، خواتینِ یورپ میں قبول اسلام کا بڑھتا ہوا رجحان اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یورپ کی تعلیم یافتہ خواتین یورپ کے قوانین کے بجائے اسلامی قوانین میں اپنے حقوق اور اپنی عفت وعصمت کا زیادہ تحفظ تصور کرتی ہیں۔

اہم ترین ذمہ داری

اسلامی قوانین کے خلاف برپا اس فیصلہ کن جنگ میں علماء، فقہاء، ماہرینِ قوانین، اصحاب فکر وقلم کی اہم ترین ذمہ داری ہے کہ آزادیٔ نسواں، مساواتِ مرد وزن جیسے پرفریب نعروں کی قلعی کھولیں، اسلام کے قوانین (خصوصاً

عائلی قوانین) کی برتری علمی انداز میں ثابت کریں اور اسلام نے خواتین پر جو احسانات کئے ہیں انہیں علمی طور پر اجاگر کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے عائلی قوانین انتہائی عادلانہ اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں، اسلام کے عائلی قوانین اور تعلیمات کے نفاذ سے سماج کے ہر فرد کو اس کا جائز حق ملتا ہے، جنسی اباحیت وانارکی کا سدباب ہوتا ہے ، خاندانی نظام میں اعتماد واستحکام پیدا ہوتا ہے۔ معاشرہ جنسی اور اخلاقی بے راہ روی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

یورپین کلچر اور عائلی قوانین

آزادئ نسواں اور مساوات مرد وزن کے پرفریب نعروں کے ساتھ مغرب نے عریانیت اور فحاشی سے لبریز جس کلچر کو فروغ دیا ہے آج وہ کلچر اس کے گلے کی ہڈی بن چکا ہے۔ یورپین کلچر اور عائلی قوانین نے امریکہ اور یورپ کے لئے ایسے سنگین بحران اور مسائل کھڑے کئے ہیں جن کا حل تلاش کرنے سے امریکہ و یورپ کے بڑے بڑے اہلِ فکر اور دانشور عاجز ہیں، وہاں کا فیملی سسٹم تباہ ہو رہا ہے خاندانی نظام کی تیلیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی ہیں، بے محابا ہوس رانی، شہوت پرستی، جنسی انارکی کا عفریت مغربی ممالک کو نگل جانے والا ہے، نوجوانوں میں جرائم کا رجحان بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے، شراب اور منشیات نے مغربی سماج کو اندر سے بالکل کھوکھلا کر دیا ہے۔

حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ امریکہ و یورپ کی ترقیات سے مرعوب ذہن جس کے ہاتھ میں ایشیاء وافریقہ کی زمام اقتدار ہے امریکہ و یورپ سے سائنس اور ٹکنالوجی درآمد کرنے کے بجائے ان ممالک کا بیمار کلچر، فحاشی، عریانت درآمد کرنے میں لگا ہوا ہے۔ مغربی ممالک سائنس اور ٹیکنالوجی سپلائی کرنے میں تو بہت بخیل ہیں، ہر قیمت پر اس پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنا چاہتے ہیں لیکن اپنا زہرناک کلچر برآمد کرنے میں بڑے فراخ ہیں۔ پوری دنیا میں تیزی کے ساتھ اپنا

متعفن کلچر اور جاں بلب خاندانی نظام پھیلانا چاہتے ہیں گنجے کی تمنا یہی ہوتی ہے کہ ہر شخص گنجا ہو جائے۔

ان حالات میں دین حق کے حاملین کی اہم ترین ذمہ داری ہے کہ دنیا کے سامنے اسلام کا نظامِ رحمت پوری جرأت اور حکمت کے ساتھ پیش کریں، یہ حقیقت واشگاف کریں کہ یورپ کی غیر انسانی تہذیب اور خودساختہ غیر فطری عائلی قوانین نے دنیا کو تباہی کے جس دہانہ پر لا کھڑا کیا ہے اس سے نجات کا واحد راستہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی قوانین پر عمل ہے۔ اعداد وشمار کی روشنی میں یہ بات واضح کریں کہ یورپ کے عائلی قوانین نے خواتین کا تحفظ کرنے کے بجائے ان کا بری طرح استحصال کیا ہے اور ان کے حقوق پامال کئے ہیں۔

ہندوستان میں یکساں سول کوڈ کی وکالت کرنے والے اسلام کے عائلی قوانین (نکاح، طلاق وغیرہ کے قوانین) کو تنقید اور تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں، ان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ مسلم پرسنل لاء میں عورتوں کے حقوق پامال کئے گئے ہیں، صنف نازک پر ظلم وستم روا رکھا گیا ہے، اس لئے یکساں سول کوڈ نافذ کر کے ان مظالم کا سدباب ضروری ہے۔ یہ حقیقت انتہائی تکلیف دہ ہے کہ ہمارے بہت سے جدید تعلیم یافتہ نوجوان جنہوں نے اسلام کے عائلی قوانین کا مطالعہ مغربی مصنفین کی عینک سے کیا ہے وہ بھی اسلام کے عائلی قوانین پر اس طرح کے اعتراضات وارد کرتے ہیں یا کم از کم اسلامی قوانین کی صلاحیت وافادیت کے بارے میں شک وارتیاب میں مبتلا ہیں ان فریب خوردہ مسلم نوجوانوں اور خواتین کو یکساں سول کوڈ کا حامی بنا کر کھڑا کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم اور یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا مطالبہ خود مسلمانوں کی صف سے ہو رہا ہے۔

ان حالات میں علماء، مفکرین اور قائدین کی یہ ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے کہ اسلام کے عائلی قوانین کی حقانیت اور برتری ثابت کرنے کے لئے ہر سطح پر پوری جدوجہد کریں، اسلام کے عائلی قوانین کا دوسرے عائلی قوانین سے نظریاتی

اور تجزیاتی سطح پر موازنہ کر کے یہ حقیقت واضح کریں کہ دنیا کی سماجی اور معاشرتی مشکلات کا حل بھی صرف اسلام کے پاس ہے، اسلامی تعلیمات ہی کے سائے میں پر امن معتدل سماجی ماحول بر پا ہوسکتا ہے، مغرب زدہ مسلم نوجوانوں اور خواتین کا اسلامی قوانین پر اعتماد بحال کیا جائے، ان کے شبہات کا ازالہ کیا جائے۔

۳-اصلاح معاشرہ

ہندوستان میں اسلام کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) کے تحفظ کے لئے ایک اہم اور ضروری کام یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلم سماج کو اسلامی خطوط پر استوار کیا جائے اور اصلاح معاشرہ کے لئے بڑے پیمانہ پر جدوجہد کی جائے، یہ واقعہ ہے کہ ہمارے سماج کا ایک بڑا طبقہ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے بالکل بیگانہ ہے، نکاح، طلاق، میراث اور دوسرے عائلی مسائل کے بارے میں اسلامی تعلیمات وتصورات سے اکثر مسلمان ناواقف ہیں۔ خاندان کے افراد دوسروں کے حقوق اور اپنے فرائض سے بے خبر ہیں۔ اسلامی تعلیمات سے بے گانگی اور صحیح اسلامی تصورات سے دوری کا نتیجہ ہے کہ ہماری خانگی زندگی کا سکون غارت ہو چکا ہے۔ ہر آن نئے نئے خانگی تنازعات وجود میں آرہے ہیں۔ شوہر بیوی سے ناخوش، بیوی شوہر سے تنگ، والدین اولاد سے نالاں، اولاد والدین سے بیزار، پھر یہ خانگی نزاعات گھر کی چہار دیواری تک محدود نہیں رہتے بلکہ بسا اوقات فتنہ وفساد، قتل وقتال، عدالتی چارہ جوئی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، یہ خانگی تنازعات عدالتوں میں پہونچنے کے بعد شاہ بانو کیس جیسی قیامت امت مسلمہ کے سر پر ڈھاتے ہیں، مخالفین کو اس بات کا موقع فراہم کرتے ہیں کہ اپنی طرف سے خوب خوب رنگ آمیزی کر کے مسلم سماج کی بھیانک رسوا کن تصویر دنیا کے سامنے پیش کریں اور اسلامی شریعت پر براہ راست حملے کریں۔

ہندو سماج سے تأثر کے نتیجہ میں بہت سی ہلاکت خیز، ہندوانہ رسمیں مسلم

سماج میں راہ پاگئی ہیں۔ بہت سے مسلم گھرانوں میں فرائض سے بڑھ کر ان رسموں کی پابندی ہوتی ہے، خواہ اس کے لئے دین وایمان، مال ودولت، راحت وسکون سب کچھ قربان کرنا پڑے، جہیز، تلک، بارات اور اس طرح کے بے شمار رسوم وآداب ہم نے غیر مسلم سماج سے قبول کر لئے ہیں، اس کے نتیجہ میں ہمارا مسلم معاشرہ شدید مصائب ومشکلات سے دوچار ہے اور ہمارے خاندانی نظام کی تیلیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی ہیں۔

مسلم معاشرہ کو اسلام کے بنیادی عقائد وتعلیمات، معاشرتی تصورات سے روشناس کرانے، معاشرتی اصلاح اور غیر اسلامی رسوم وعادات کے استیصال کے لئے بڑے پیمانہ پر مسلسل، منظّم اور مثبت جدوجہد کی ضرورت ہے، یہ کام جس قدر صبر آزما اور مشکل ہے اتنا ہی ضروری ہے، لیکن یہ کام نہ تنہا چند افراد کے بس کا ہے نہ کسی ایک جماعت کے، مسلمانوں کی تمام دینی وملی جماعتیں اور ادارے نیز علماء ومصلحین، ائمہ مساجد، مقررین، قائدین اور اہل دانش اگر اس کام میں پوری دل چسپی لیں تو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہونے کی امید ہے۔

الحمدللہ حالیہ برسوں میں اصلاح معاشرہ کی تحریک نے کچھ زور پکڑا ہے، سماج پر اس کے کچھ خوشگوار اثرات بھی پڑے ہیں لیکن ابھی یہ کوششیں مطلوبہ مقدار اور معیار سے بہت کم ہیں، پھر بسا اوقات ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ کانفرنسیں اور جلسے کرنا خود مقصد بن کر رہ گیا ہے ان کے بعد سعی وعمل میں تیزی آنے کے بجائے سناٹا سا چھا جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

۴-اسلامی نظام عدل کا قیام

ہندوستان کے مسلم سماج میں کرنے کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ پورے ملک میں دار القضاء قائم کئے جائیں، ملک کے ہر ہر علاقہ میں اسلامی عدالتوں کا جال بچھا دیا جائے، مسلمان طے کرلیں کہ اپنے مقدمات خصوصاً خانگی اور عائلی

تنازعات سرکاری عدالتوں کے بجائے دارالقضاء میں لے جائیں گے اوران کے فیصلے خوشی خوشی اپنے اوپر نافذ کریں گے، شرعی دارالقضاء کا قیام مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے اور موجودہ حالات میں اسلام کے عائلی قوانین کو اسلام دشمنوں کی دست برد سے محفوظ رکھنے کا بڑا ذریعہ بھی ہے۔

مسلمانوں میں یہ احساس بیدار کیا جائے کہ باہمی نزاعات میں مسلمان قاضی سے فیصلہ حاصل کرنا ان کی دینی ذمہ داری ہے۔ پورے ملک میں نظام قضاء کے لئے فضا ہموار کی جائے، دارالقضاء قائم کیے جائیں، یہ دارالقضاء منظم، باضابطہ اوراحساس ذمہ داری کے ساتھ قیام عدل کا فریضہ انجام دینے والے ہوں کہ لوگوں کو ان پر پورا بھروسہ ہو۔

مسلم پرسنل لا بورڈ نے ضرورت اور حالات کی نزاکت محسوس کر کے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں نظام قضاء قائم کرنے کی جدوجہد شروع کردی ہے لیکن ابھی اس کی رفتار دھیمی ہے، تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا ہے کہ قیامِ دارالقضاء کی کوششوں میں تیزی لائی جائے اور چند برسوں میں پورے ہندوستان میں دارالقضاء کا جال بچھا دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسلام کے احکام وتعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ہندوستان میں بچے کھچے اسلامی قانون کے سرمایے کی حفاظت فرمائے، اورگم شدہ اسلامی سرمایہ کی بازیابی میں کامیاب فرمائے۔

(ماہنامہ الفرقان لکھنؤ ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۵ء)

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے چند سال پہلے ’’مسلم پرسنل لا سے متعلق پارلیمنٹ سے منظورشدہ متفرق ایکٹ‘‘ کے نام سے ایک مختصر کتابچہ شائع کیا تھا، اس کتابچہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد اسلام کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) کے میدان میں کیا کیا قانون سازی ہوئی ہے، ہندوستان میں اسلامی شریعت کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ان متفرق ایکٹ سے واقفیت بہت ضروری ہے۔

اس کتاب میں بورڈ کے اس کتابچہ کو شامل کرکے شائع کیا جارہا ہے تاکہ مسلم پرسنل لا سے متعلق یہ اہم قوانین اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے علم وواقفیت میں رہیں۔

عتیق احمد بستوی

مسلم پرسنل لا سے متعلق پارلیمنٹ سے منظورشدہ متفرق ایکٹ

مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق ایکٹ ۱۹۳۷ء

تعارف

برطانوی ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ خواہش رہی ہے کہ ان کے رواجی قوانین کو مسلم پرسنل لا پر کسی حال میں ترجیح نہ دی جائے، اس مسئلہ پر اخبارات اور جلسوں میں بھی شدت سے اظہار خیال کیا گیا، مسلمانوں کے رواجی قوانین کے تحت مسلم خواتین کا مرتبہ محض تحقیر اور بے توقیری کا ہے، مسلم خواتین کی تمام تنظیموں نے ان رواجی قوانین کی مذمت کی ہے کیونکہ یہ ان کے مفادات پر برا اثر ڈالتے ہیں، ان کا مطالبہ ہے کہ مسلم پرسنل لا (شریعت) کا اطلاق ان پر کیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ۲۶ر ستمبر ۱۹۳۵ء کو قانون ساز اسمبلی میں مسلم پرسنل لا (شریعت) بل (نمبر ۳۹-۱۹۳۵) پیش کیا گیا، یہ بل سلیکٹ کمیٹی کو بھیجا گیا، سلیکٹ کمیٹی کی سفارشات کو شامل کرکے یہ بل دوبارہ قانون ساز اسمبلی میں پیش کیا گیا۔

وجوہات ومقاصد کا بیان

ایک عرصہ سے برطانوی ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ خواہش رہی ہے کہ ان کے رواجی قوانین کو مسلم پرسنل لاء کی جگہ نافذ نہ کیا جائے۔ اخبارات اور

جلسوں میں بھی بار بار اسے دوہرایا گیا۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی مذہبی تنظیم جمعیۃ علماء ہند نے بھی اس کی حمایت کی ہے اور تمام متعلقہ حکام کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ ایسا بل فوری طور پر پیش کیا جائے۔ رواجی قوانین کو یہ غلط نام دیا گیا ہے کیونکہ ان کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے اور اس میں بکثرت تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور مستقبل میں کبھی وہ اعتبار اور قطعیت حاصل نہیں کر سکتے جو کہ ایک قانون کی خصوصیت ہوتی ہے۔ ان موروثی رواجوں کے تحت مسلم خواتین کا مرتبہ محض بے وقعتی کا ہے۔ خواتین کی تمام مسلم تنظیموں نے ان موروثی رواجوں کی مذمت کی ہے جن سے ان کے حقوق پر برا اثر پڑتا ہے۔ لہذا ان کا مطالبہ ہے کہ مسلم پرسنل لا (شریعت) کا اطلاق ان پر کیا جائے، مسلم پرسنل لا کے نافذ العمل ہونے سے انہیں خود بخود وہ مرتبہ حاصل ہو جائے گا جس کی وہ فطری طور پر مستحق ہیں، علاوہ ازیں اگر موجودہ بل پاس ہو گیا تو اس کا معاشرہ پر مفید اثر ہوگا کیونکہ اس سے عوام کے باہمی حقوق وفرائض میں واقعیت اور قطعیت پیدا ہوگی، مسلم پرسنل لا (شریعت) ایک ایسا ضابطہ ہے جو واقعی شکل میں موجود اور اتنا معروف ہے کہ اس کے وجود میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور نہ اس کا مسودہ مرتب کرنے میں زیادہ دشواری پیش آئے گی، جیسا کہ موروثی قوانین کے سلسلہ میں آتی ہے۔

۱۹۳۷ء کا ۲۶واں ایکٹ

قانون سازیہ نے مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق بل پاس کر دیا اور ۷/اکتوبر ۱۹۳۷ء کو اسے منظوری حاصل ہوگئی اور قانون کی کتاب میں اسے بعنوان مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق ایکٹ ۱۹۳۷ء (۱۹۳۷ کا ۲۶واں ایکٹ) کے طور پر درج کیا گیا، کیونکہ لفظ مسلم Moslem کو اب Muslim لکھا جاتا ہے۔ لہذا اب یہ انہی حروف تہجی کے مطابق مسلم (Muslim) پرسنل لا (شریعت) اطلاق ایکٹ ۱۹۳۷ء مانا جائے گا۔

مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق ایکٹ ۱۹۳۷ء

(۱۹۳۷ء کا ۲۶واں ایکٹ)

ایکٹ جس کا مقصد مسلم پرسنل لا (شریعت) کا مسلمانوں پر نفاذ کرنا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں پر مسلم پرسنل لا (شریعت) کے نفاذ کے ضوابط مرتب کرنا قرین مصلحت ہے، لہذا انہیں حسب ذیل طور پر قانون کی صورت میں مرتب کیا جاتا ہے۔

۱- مختصر عنوان اور دائرہ اثر

۱- اس ایکٹ کو مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق ایکٹ ۱۹۳۷ء کہا جائے گا۔

۲- اس کا نفاذ پورے ہندوستان پر ہوگا (ماسوائے ریاست جموں وکشمیر)۔

۲- کسی معاملے میں (سوائے زرعی اراضی کے معاملات) میں موروثی ضوابط ورواج اس کے برعکس ہونے مثلاً وصیت کردہ حق جانشینی، خواتین کی خصوصی مملوکہ جائداد بشمول وہ جو ورثہ میں پائی ہو، یا کسی اقرار نامہ یا ہدیہ کے طور پر حاصل ہوئی ہو، یا پرسنل لا کے کسی دیگر ضابطے شادی، فسخ نکاح، بشمول طلاق، ایلا، ظہار، خلع اور مبارات، نان ونفقہ، مہر، ولایت، ہدیہ، وقف اور وقف کی جائدادیں اور اوقاف (ماسوائے خیراتی، یا خیراتی اداروں، اور خیراتی ومذہبی اوقاف) ایسے تمام کیسوں میں جن میں فریقین مسلم ہوں ان پر مسلم پرسنل لا (شریعت) کا اطلاق ہوگا۔

٣-بیان حلفی دینے کا اختیار

ا-وہ شخص جو متعلقہ حاکم کو مندرجہ ذیل امور کی بابت مطمئن کر سکے۔

الف-یہ کہ وہ مسلمان ہے

ب-یہ کہ وہ انڈین کنسریکٹ ایکٹ ۱۸۷۲ء کے تحت کنسٹریکٹ (اقرار نامہ) کا مجاز ہے۔

ج-یہ کہ وہ اس خطہ کا رہنے والا ہے جہاں اس ایکٹ کا نفاذ ہوتا ہے۔

وہ ایک مقررہ فارم پر حاکم مجاز کے روبرو یہ بیان دے سکتا ہے کہ وہ اس ایکٹ کے ضوابط کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔لہذا اس پر،اس کے نابالغ بچوں پر اور ان کی آئندہ نسل پر دفعہ (۲) کا اطلاق ہوگا، جیسا کہ ان ضوابط میں وصیت و وراثت وغیرہ سے متعلق امور کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

۲-اگر متعلقہ حاکم ذیلی دفعہ(ا) کے تحت بیان کو تسلیم کرنے سے انکار کردے تو وہ شخص اس حاکم کے روبرو اپیل کرسکتا ہے جسے ریاستی حکومت نے عام یا خصوصی حکم کے ذریعہ اس مقصد کے لئے مقرر کیا ہوا گر وہ حاکم مطمئن ہے کہ شخص مذکور کو ایسا بیان دینے کا اختیار ہے تو وہ افسر متعلقہ کو ہدایت کرسکتا ہے کہ وہ اس فارم کو بیان حلفی کے طور پر قبول کرے۔

٤-ضوابط بنانے کا اختیار

ا-اس ایکٹ کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے ریاستی سرکار ضوابط مرتب کرسکتی ہے۔

۲-مذکورہ بالا اختیارات پر اثر انداز ہوئے بغیر ریاستی حکومت مندرجہ ذیل امور سے متعلق ضوابط بنا سکتی ہے۔

(الف) اس اتھارٹی کا تقرر جس کے روبرو ایکٹ کے تحت بیان حلفی کا

فارم پیش کیا جائے گا۔

(ب) بیان داخل کرنے کے لئے فیس مقرر کرنا اور ایکٹ کے تحت سرکاری فرائض کی انجام دہی کی غرض سے کسی شخص کی رہائش گاہ پر جانے کی فیس۔

(ج) وقت کا تعین کرنا جب کہ یہ فیس ادا کی جائے گی اور وہ طریقہ کار جس کے مطابق انہیں عائد کیا جائے گا۔

۳-اس دفعہ کی مندرجات کے تحت مرتب کئے گئے ضوابط سرکاری گزٹ میں شائع کئے جائیں گے اور اس کے بعد ان کا نفاذ اسی طرح ہوگا جیسے وہ اس ایکٹ کا حصہ ہو۔

۴-اس ایکٹ کے تحت مرتب کردہ ضوابط کو ترتیب کے فوراً بعد ریاستی قانون سازیہ میں پیش کیا جائے گا۔

۵-بعض حالات میں عدالت کے ذریعہ فسخ نکاح (خلع ایکٹ ۱۹۳۹ء کے بعد یہ منسوخ ہوگیا)

٦-تنسیخ-مندرجہ ذیل ایکٹوں کی درج ذیل دفعات اور ان کے تحت مرتب کردہ ضوابط کو منسوخ کر دیا جائے گا چونکہ وہ اس ایکٹ کی مندرجات سے غیر مربوط ہیں۔

ا-بمبئی ضوابط ۱۸۲۷ کی دفعہ ۲٦

۲-مدارس سول کورٹ ایکٹ ۱۸۷۳ کی دفعہ ۱٦

۳-اودھ ایکٹ ۱۸۷۲ کی دفعہ ۳

۴-پنجاب لازا یکٹ ۱۸۷۲ کی دفعہ ۵

۵-صوبہ جات متحدہ لازا یکٹ ۱۸۷۵ کی دفعہ ۵

٦-اجمیر لازا یگولیشنز ۱۸۷۷ کی دفعہ ۴

فسخ نکاح (خلع) ایکٹ ۱۹۳۹ء

تعارف

اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کا نان ونفقہ ادا نہیں کرتا، یا اس سے علیحدگی اختیار کر کے اس کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے، یا اس سے برابر بُرا سلوک کرتا ہے یا اسے بے سہارا چھوڑ دیتا ہے، ایسے اور اسی قسم کے دیگر حالات میں فقہ حنفی میں ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وہ عورت فسخ نکاح (خلع) کے لئے عدالت سے ڈگری لے سکے، ایسی کوئی گنجائش نہ ہونے کے سبب برطانوی ہندوستان میں مسلمان خواتین کو ناقابل بیان مصائب کا شکار ہونا پڑتا تھا۔ حنفی فقہاء نے اس واضح رائے کا اظہار کیا ہے کہ جہاں فقہ حنفی کے اطلاق سے مشکلات پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں فقہ شافعی، مالکی اور حنبلی کا اطلاق کرنا جائز ہے، لیکن دیکھا یہ گیا کہ عدالتیں فقہ مالکی کا اطلاق کرنے سے ہچکچاتی تھیں، لہذا فسخ نکاح سے متعلق تمام قوانین کو یکجا کرنے کی غرض سے قانون سازیہ (Legislature) میں فسخ نکاح بل پیش کیا گیا۔

وجوہات ومقاصد کا بیان

اگر کوئی شوہر اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کرے، اسے نان ونفقہ ادا نہ کرے، اس سے برا سلوک کرے اور اسے بے سہارا چھوڑ کر اس کی زندگی کو عذاب بنا دے، ایسے اور اسی قسم کے دیگر حالات میں فقہ حنفی کے تحت ایک مسلم عورت کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ عدالت سے فسخ نکاح کی ڈگری لے سکے، ایسی کوئی گنجائش نہ ہونے کے سبب برطانوی ہندوستان میں ان گنت عورتوں کو ناقابل بیان

مصائب کا شکار ہونا پڑتا تھا۔ حالانکہ حنفی فقہاء نے یہ بات واضح طور پر لکھی ہے کہ مالکی شافعی وحنبلی فقہ پر عمل کرنا جائز ہے۔ اس اصول پر عمل کرتے ہوئے علماء نے فتوے دئے ہیں کہ ان حالات میں جو اس بل کے حصہ اول کے کلاز (۳) کے تحت درج کئے گئے ہیں (اب ایکٹ کی دفعہ (۲) ملاحظہ کیجئے) اب ایک مسلم عورت عدالت سے فسخ نکاح کی ڈگری لے سکتی ہے، مولانا اشرف علی صاحبؒ نے کتاب الحیلۃ الناجزۃ میں اصول صراحت سے بیان کیے ہیں، انہوں نے فقہ مالکی کی ان دفعات کا مبسوط انداز میں جائزہ لیا ہے جن کا ہندوستان میں واقع صورت حال میں اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ علماء کی بڑی تعداد نے اس کی تائید کی ہے جنہوں نے کتاب پر اپنی منظوری کی مہر ثبت کی ہے، کیونکہ عدالتیں مسلم خواتین کے مقدمات میں فقہ مالکی پر عمل کرنے میں پس وپیش کرتی رہیں گی لہذا لاتعداد مسلم خواتین کو آلام ومصائب سے چھٹکارا دلانے کی غرض سے مذکورہ بالا اصول کو تسلیم کرنے اور اس کا نفاذ کرنے کے لئے قانون سازی ضروری ہے۔

فسخ نکاح سے متعلق ایک اور بات رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ برطانوی ہندوستان میں عدالتوں نے یہ فیصلے صادر کئے کہ ایک مسلمان عورت کے مرتد ہو جانے کی صورت میں نکاح فسخ ہو جاتا ہے، وکیلوں کی انجمن (بار) نے متعدد بار اس نظریہ کو چیلنج کیا ہے لیکن عدالتیں مسلم قانون کی غلط تشریح کے تحت دی گئی رولنگ کو بطور نظیر مان کر ایسے ہی فیصلے کئے جا رہی ہیں، علماء نے فتوے دئے ہیں کہ عورت کے مرتد ہو جانے کی صورت میں اس کا نکاح فسخ نہیں ہوتا، مسلم فرقے نے بھی عدالت کے ان فیصلوں پر اپنی انتہائی بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے، اخبارات میں متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ عدالتوں نے جو غلطیاں کی ہیں ان کی اصلاح کے لئے قانون بنایا جائے لہذا اس بل میں شامل کرنے کے لئے کلاز (۵) (اب ملاحظہ ہو دفعہ-۴) تجویز کی جاتی ہے۔

اس بل کے ذریعہ فسخ نکاح سے متعلق جملہ قوانین کو یکجا اور متحد کردیا گیا ہے اس امید کے ساتھ کہ اس سے ہندوستانی مسلمانوں کی ایک پرانی ضرورت پوری ہوجائے گی۔

۱۹۳۹ء کا ایکٹ (۸)

فسخ نکاح کا بل اسمبلی میں پاس ہوگیا اور ۱۷؍مارچ ۱۹۳۹ء کو اسے منظوری بھی حاصل ہوگئی اور قانون کی کتاب میں اسے فسخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء (۱۹۳۹ء کا آٹھواں ایکٹ) کے طور پر درج کیا گیا۔

فسخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء

(۱۹۳۹ء کا آٹھواں ایکٹ)

مسلم قانون کے تحت مسلم خواتین کی شادی کو فسخ کرنے کے قانون کی تشریح اور یکجا کرنے کے لئے ایکٹ نیز مسلم شادی شدہ خاتون کے اسلام ترک کرنے کی صورت میں اس شادی پر مرتب ہونے والے اثرات کی بابت شکوک کا ازالہ ہوگیا یہ قرین مصلحت ہے کہ مسلم قانون کے تحت شادی شدہ خواتین کے فسخ نکاح سے متعلق قانون کی وضاحت کی جائے اور اسے یکجا کردیا جائے اور شادی شدہ مسلم خاتون کے ترک اسلام کی صورت میں اس کے ازدواجی رشتہ کی بابت شکوک وشبہات کا ازالہ کیا جائے، بنابریں حسب ذیل طور پر قانون بنایا جاتا ہے۔

۱۔مختصر عنوان اور دائرہ اثر

(۱) اس قانون کو فسخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء کہا جائے گا۔

(۲) اس کا اطلاق پورے ہندوستان پر ہوگا سوائے ریاست جموں اور کشمیر۔

ریاستی ترمیم

پانڈیچری- دفعہ (۱) کے تحت ذیلی دفعہ (۲) کے بعد حسب ذیل اضافہ کیا جائے (اس شرط کے ساتھ کہ اس ایکٹ کی مندرجات کا نفاذ پانڈیچری کے ترک تعلق کرنے والوں پر نہیں ہوگا)۔ دیکھئے پانڈیچری (قانون کی توسیع) ایکٹ ۱۹۶۸ء کی دفعہ (۳)۔

۲-فسخ نکاح کی عدالتی ڈگری لینے کی وجوہات

ایک مسلم خاتون جس کی شادی مسلم قانون کے تحت ہوتی ہے، وہ مندرجہ ذیل وجوہات واسباب میں سے کسی ایک یا متعدد اسباب کی بنا پر فسخ نکاح کے لئے عدالتی ڈگری لینے کی حقدار ہوگی۔

۱-یہ کہ چار سال سے زیادہ مدت سے اس کے شوہر کے بارے میں کوئی پتا نہیں ہے۔

۲-یہ کہ شوہر نے اسے نظر انداز کر دیا ہے اور دو سال سے نان ونفقہ نہیں دیا ہے۔

۳-یہ کہ شوہر کو سات سال یا اس سے زیادہ کی سزائے قید ہوئی ہے۔

۴-یہ کہ شوہر نے تین سال سے زیادہ کی مدت سے بغیر کسی معقول وجہ کے ازدواجی ذمہ داریاں ادا نہیں کی ہیں۔

۵-اور یہ کہ شوہر شادی کے وقت جماع پر قادر نہ تھا (یعنی نامرد تھا) اور بعد میں بھی ویسا ہی رہا۔

۶-یہ کہ شوہر دو سال سے مجنون ہے یا برص کے مرض میں مبتلا ہے یا مہلک پوشیدہ بیماری میں مبتلا ہے۔

۷-یہ کہ جب اس کے باپ یا دیگر سرپرستوں (ولی) نے اس کی شادی کی تو اس کی عمر پندرہ سال سے کم تھی لہذا ۱۸ر سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہونے والی شادی منسوخ ہے۔

اس شرط کے ساتھ کہ ازدواجی تعلق کی تکمیل نہیں ہوئی ہو۔

۸-یہ کہ شوہر اس پر ظلم کرتا ہے یعنی:

(الف) مار پیٹ کرنے کا عادی ہے یا اپنے برتاؤ سے اس نے اس عورت کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے خواہ اس برتاؤ میں جسمانی ایذا رسانی شامل نہ ہو۔

(ب) بدنام عورتوں سے تعلقات رکھتا ہے یا بدنامی کی زندگی

گذارتا ہے۔

(ج) اسے غیر اخلاقی زندگی گذارنے پر مجبور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(د) اس کی جائداد کو فروخت کرتا ہے اسے پر اس کے قانونی حقوق پر عمل کرنے سے روکتا ہے۔

(ہ) اسے اس کے مذہبی فرائض وشعائر کی ادائیگی سے روکتا ہے۔

(د) اگر اس کے ایک سے زیادہ بیویاں ہیں تو وہ قرآنی حکم کے مطابق اس سے مساوات کا سلوک نہیں کرتا۔

۹-کوئی اور وجہ جو مسلم قانون کے تحت فسخ نکاح (خلع) کے لئے جائز تسلیم کی گئی ہو۔ بشرطیکہ:

۱-جب تک سزا کے بارے میں قطعی فیصلہ نہ ہو جائے کوئی عدالتی ڈگری نہیں دی جائے گی۔

۲-(۱) کے تحت مندرج سبب کی بنا پر دی گئی عدالتی ڈگری تاریخ اجراء سے چھ ماہ کی مدت تک نافذ نہیں ہوگی، اور اگر اس مدت کے دوران شوہر خود حاضر ہو جائے یا اپنے با اختیار ایجنٹ کے ذریعہ عدالت کو یہ یقین دلائے کہ وہ اپنی ازدواجی ذمہ داریاں نباہنے کو تیار ہے تو مذکورہ بالا ڈگری خارج کر دی جائے گی۔

(۲) اوپر مذکور اسباب میں سے سبب (۵) کے تحت ڈگری جاری کرنے سے پہلے عدالت شوہر کی درخواست پر یہ حکم جاری کرے گی کہ وہ ایک سال کے اندر عدالت کو مطمئن کرے کہ وہ اب نامرد نہیں ہے اور اگر شوہر اس بارے میں عدالت کو مطمئن کر دیتا ہے تو اس وجہ کے تحت کوئی ڈگری نہیں دی جائے گی۔

۳-اس مقدمہ میں جس پر دفعہ (۲) کی کلاز (۱) کا اطلاق ہوتا ہو شوہر کا اتا پتا نہ معلوم ہونے کی صورت میں اس کے ورثاء (متعلقین) کو نوٹس جاری کرنا۔

(الف) ان افراد کے نام اور پتے استغاثہ کی عرضی میں پیش کئے

جائیں گے جو عرضی دائر کرنے کی تاریخ کو شوہر کے انتقال کر جانے پر مسلم قانون کے تحت اس کے وارث قرار پاتے ہوں۔

(ب) ان لوگوں پر عدالتی سمن کی تعمیل کرائی جائے گی۔

(ج) مقدمہ میں ان لوگوں کو اپنی بات کہنے کا حق حاصل ہوگا۔

اس شرط کے ساتھ کہ شوہر کے چچا اور اس کے بھائی اگر کوئی ہوں تو ان کو بھی فریق مقدمہ بنایا جائے گا خواہ ان کا شمار ورثاء میں نہ ہو۔

۴-تبدیلیٔ مذہب کے اثرات

اگر کوئی شادی شدہ مسلم خاتون مذہب اسلام ترک کردے یا اسلام چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب کو قبول کرلے تو اس سے خود بخود اس کی شادی کالعدم نہیں ہوجائے گی۔

اس شرط کے ساتھ کہ ترک مذہب یا تبدیلیٔ مذہب کی صورت میں عورت کو حق حاصل ہوگا کہ وہ دفعہ (۲) کے تحت فسخ نکاح کے لئے عدالت سے ڈگری حاصل کرسکتی ہے۔

اس مزید شرط کے ساتھ کہ اس دفعہ کی مندرجات کا اطلاق ایسی عورت پر نہیں ہوگا جس نے اسلام قبول کیا ہو یا اپنے پہلے مذہب کو دوبارہ قبول کیا ہو۔

۵-مہر کے حق میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی

فسخ نکاح کے وقت مسلم قانون کے تحت ایک شادی شدہ خاتون کو اپنے مہر یا اس کے کسی جزو پر جو اختیارات حاصل ہیں اس ایکٹ کی مندرجات سے ان حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

قاضی ایکٹ ۱۸۸۰ء

تعارف

فقہ کی کتاب ہدایہ میں قاضی کے اہم اختیارات کو کسی قدر وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، قاضی دراصل جوڈیشیل افسران ہوتے تھے۔ جن کا تقرر ریاست کی طرف سے کیا جاتا تھا اور انہیں جج یا مجسٹریٹ کہا جاسکتا ہے۔ اس ملک میں برطانوی اقتدار سے قبل قاضی کی ذمہ داریاں کچھ شرعی اور کچھ دنیاوی نوعیت کی ہوتی تھیں، برطانوی اقتدار کے بعد جب ججوں اور مجسٹریٹوں کا تقرر رہوا تو قاضی کا عدالتی عہدہ ختم ہوگیا تاہم برطانوی سرکار نے قاضیوں کی جوڈیشیل پوزیشن کو تسلیم نہ کرتے ہوئے بھی قاضیوں کا عہدہ سرکاری طور پر ختم نہیں کیا۔ بعض ضوابط کے ذریعہ ریاستی حکومت کی طرف سے قاضی القضاۃ اور قاضی کا تقرر کیا گیا اور ان کے غیر جوڈیشیل ذمہ داریوں کو ازروئے قانون تسلیم کیا گیا۔ ۱۸۶۴ء میں ایک ایکٹ (ایکٹ نمبر-۱۱) کے ذریعہ حکومت کی طرف سے قاضیوں کا تقرر اور ان کے غیر جوڈیشیل اختیارات کو منسوخ کردیا گیا، لیکن اس ایکٹ سے ایک قسم کی دقت پیش آئی جس کا اندازہ ایکٹ پاس کرتے وقت نہیں کیا گیا تھا۔ لہٰذا مسلم فرقے کی مشکلات کا ازالہ کرنے کے لئے اسمبلی میں قاضی بل پیش کیا گیا۔

اسباب ومقاصد کا بیان

محمڈن لا کے تحت قاضی ایک جوڈیشیل افسر ہوتا تھا، اس کی ذمہ داریوں کا بیان ہدایہ میں قدرے وضاحت سے کیا گیا ہے، اس کا تقرر حکومت کی طرف سے کیا جاتا تھا اور اسے ہمارے جج یا مجسٹریٹ کے مساوی سمجھا جاسکتا ہے، اس

ملک میں برطانوی اقتدار سے قبل قاضی محمڈن لا کے تحت اپنی ذمہ داریوں کے علاوہ دیگر ذمہ داریاں بھی انجام دیتا تھا، اس کا کام جزوی طور پر شرعی اور جزوی طور پر دنیاوی ہوتا تھا ان ذمہ داریوں میں جائداد سے متعلق دستاویزات تیار کرنا، ان کی تصدیق کرنا، ان کی رجسٹری کرنا، نکاح پڑھانا اور دیگر رسوم وارکان کا ادا کرنا تھا۔ یہ واضح نہیں ہے کہ آیا یہ تمام ذمہ داریاں اس کے فرائض منصبی کا لازمی حصہ تھیں، غالباً ان رسوم وارکان کی انجام دہی قاضی کے سرکاری ملازم ہونے اور قانون کے تحت اس کی ذمہ دارانہ حیثیت کے سبب تھی اور قاضی ہونے کے ناطے اسے ان امور کی انجام دہی کے لئے زیادہ موزوں سمجھا جاتا تھا۔

دیسی حکمرانوں کے دور میں یہ قاضی کی پوزیشن تھی، برطانوی اقتدار آنے پر قاضیوں کی جگہ ججوں اور مجسٹریٹوں نے لے لی اور بطور جوڈیشیل افسر قاضیوں کی حیثیت ختم ہوگئی، لیکن برطانوی سرکار نے قاضیوں کی جوڈیشیل حیثیت کو تسلیم نہ کرتے ہوئے بھی قاضی کا عہدہ ختم نہیں کیا، وقتاً فوقتاً ضوابط جاری کرکے ریاستی حکومت نے قاضی القضاۃ اور قاضیوں کا تقرر جاری رکھا اور ان کے غیر جوڈیشیل فرائض کو قانون کے تحت تسلیم کیا گیا، بنگال میں تو انہیں کچھ مزید ذمہ داریاں بھی سونپ دی گئیں، قانونی ضوابط کے تحت قاضیوں کی ذمہ داریاں کچھ اس قسم کی تھیں۔

۱- انتقال جائداد کی دستاویزات اور دیگر کاغذات تیار کرنا اور ان کی تصدیق کرنا۔

۲- نکاح پڑھانا اور طلاق کی کارروائی کی تکمیل کرنا۔

۳- مختلف مذہبی رسوم وارکان کی ادائیگی۔

۴- قرق کی ہوئی جائدادوں کی فروخت کی نگرانی کرنا، خیراتی اور دیگر قسم کی پنشن اور بھتوں کی ادائیگی کرنا۔

بعد کو کی گئی قانون سازی کے تحت اوپر درج پہلی اور آخری ذمہ داری

ان مقاصد کے لئے خصوصی طور پر مقرر کردہ افسران کو سونپ دی گئی اور اب قاضیوں کے پاس کوئی کام نہیں رہ گیا۔ لہذا ۱۸۶۴ء کے ایکٹ نمبر-۱۱ کے مطابق حکومت کی طرف سے قاضیوں کے تقرر سے متعلق تمام ضوابط منسوخ کردئے گئے تاہم ان کے موروثی اور رسمی فرائض سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا اس مقصد سے ایکٹ میں ایک دفعہ کا اضافہ کیا گیا جو حسب ذیل ہے۔

اس قانون کی کسی دفعہ کے تحت قاضی القضاۃ یا قاضیوں کو ان فرائض اور ذمہ داریوں کی انجام دہی میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی جو محمڈن لا کے تحت انجام دینے کی ان سے درخواست کی جائے (ایکٹ نمبر-۱۱ کی دفعہ-۲) اس طرح ۱۸۶۴ء کے ایکٹ نمبر-۱۱ کے پاس ہونے سے یہ ثابت ہوگیا کہ مسلم فرقہ میں قاضی کی خاصی اہمیت ہے اور اس طرح اس کی بعض ذمہ داریاں بھی باقی رہ گئیں، اس سے پہلے اس کے عدالتی فرائض کے علاوہ جو اضافی ذمہ داریاں تھیں اب وہی اس کی اصل ذمہ داریاں بن گئیں اور کچھ علاقوں میں بعض مذہبی امور کی انجام دہی کے لئے قاضی کی حاضری ضروری سمجھی جاتی ہے۔

۱۸۶۴ء کے ایکٹ سے ایک مشکل پیش آئی جس کا اندازہ بل پاس کرتے وقت نہیں لگایا جاسکا، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا قاضی کا تقرر حکومت کی طرف سے ہوتا تھا اور مدراس اور بمبئی ہائی کورٹوں کی جانب سے بھی یہ فیصلہ صادر کیا گیا ہے کہ قاضی کا تقرر سرکاری طور پر ہی ہونا چاہئے۔ لیکن ۱۸۶۴ء ایکٹ کے تحت حکومت نے قاضی کے تقرر کی ذمہ داری سے خود کو الگ کرلیا، ایکٹ کے مسودہ میں کہا گیا کہ یہ قرین مصلحت نہیں ہوگا کہ سرکار قاضیوں کا تقرر کرے، اس طرح اب مشکل پیش آئی کہ حکومت جائز طریقہ سے کوئی تقرر نہیں کرسکتی، اس کے سبب مسلم فرقہ کو جو مشکلات پیش آرہی ہیں ان کی طرف مسلمانوں نے خصوصاً مدراس پریزیڈنسی کے مسلمانوں نے حکومت کو توجہ دلائی لہذا یہ محسوس کیا گیا کہ حکومت کی طرف سے دوبارہ قاضیوں کی تقرری کا عمل اپنے ہاتھ میں لینا ایک

مناسب رعایت ہے جو مسلمانوں کو دی جانی چاہئے۔ پس اس مقصد کے لئے یہ بل تیار کیا گیا ہے۔ فی الحال اس کا نفاذ صرف مدراس میں ہی ہوگا کیونکہ وہاں اس کی زیادہ ضرورت محسوس کی جارہی ہے، تاہم اس میں یہ گنجائش موجود ہے کہ اگر کسی جگہ کے مسلمان ایسا مطالبہ کریں تو وہاں کی حکومت اس کا نفاذ کرسکتی ہے۔ اس سے قاضیوں کو قانونی حقوق یا فرائض حاصل نہیں ہوجاتے، اس کا مقصد محض مسلمانوں کے ایک مطالبہ کو پورا کرنا ہے کہ حکومت کی طرف سے قاضیوں کا تقرر کیا جائے، ان کی ذمہ داریوں کی بابت اس میں کچھ نہیں کہا گیا ہے وہ وہی ہوں گی جو اب تک ہیں، اس کے کسی امکانی غلط استعمال کو روکنے کے لئے ایکٹ میں یہ استثنائی دفعہ شامل کردی گئی ہے ’’اس سے قاضی کو کوئی قانونی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے، اور شادی کے موقعہ پر اس کی حاضری لازمی نہیں ہوگی اگر وہاں اس کی حاضری مطلوب نہ ہو‘‘۔

قاضی ایکٹ ۱۸۸۰ء

(۹؍جولائی ۱۸۸۰ء)

(۱۸۸۰ء کا ۱۲؍واں ایکٹقاضی کے منصب پر افراد کی تقرری کا ایکٹ) چونکہ ۱۸۶۴ء کے ایکٹ نمبر-۱۱ کے ذریعہ (یہ ایکٹ ہندو اور مسلم لاء افیرز اور قاضی القضاۃ اور قاضی کے عہدوں پر تقرری منسوخ کرنے اور سابقہ تقرر کو ختم کرنے کے لئے پیش کیا گیا تھا) یہ کہا گیا تھا کہ یہ بات قرین مصلحت ہے کہ قاضی القضاۃ یا شہر قصبہ پرگنہ قاضی کا حکومت کے ذریعہ کئے گئے تقرر کو منسوخ کردیا جائے، اس طرح اس ایکٹ کے تحت یہ تقرریاں منسوخ کردی گئیں، چونکہ ہندوستان کے بعض حصوں میں شادی وغیرہ کی تقریبات میں حکومت کی طرف سے مقرر کردہ قاضی کی حاضری مطلوب ہوتی ہے، لہذا یہ امر قرین مصلحت سمجھا گیا کہ حکومت پھر سے قاضیوں کی تقرری کا اختیار حاصل کرے۔ چنانچہ اسی مقصد سے یہ ایکٹ بنایا گیا ہے۔ مختصر عنوان سے قاضی ایکٹ ۱۸۸۰ء کہا جائے گا۔

دائرہ اثر

فی الحال اس کا نفاذ ان علاقوں پر ہوگا جو کونسل گورنر قلعہ سینٹ جارج کی عملداری میں ہیں، لیکن دوسری صوبائی حکومتیں سرکاری نوٹیفکیشن جاری کر کے اپنے علاقے میں اس کا نفاذ کرسکتی ہیں۔

کسی مقامی علاقے میں قاضی کے تقرر کا اختیار۔ اگر کسی علاقہ میں

مسلمانوں کی خاصی تعداد ہو اور وہ حکومت سے قاضی یا قاضیوں کے تقرر کا مطالبہ کریں اور حکومت اسے مناسب سمجھے تو وہ علاقے کے با اثر مسلمانوں کے مشورہ سے موزوں افراد کا بطور قاضی تقرر کر سکتی ہے۔ اگر کہیں پر یہ سوال پیدا ہو کہ کیا سرکار کی طرف سے اہل افراد کو قاضی کے منصب پر فائز کیا گیا تو اس تنازعہ کا حتمی فیصلہ صوبائی حکومت کرے گی۔

اگر کوئی قاضی اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران کوئی غیر ذمہ دارانہ حرکت کا مرتکب ہو یا مسلسل چھ ماہ تک اس علاقہ سے غیر حاضر رہے جہاں اس کے ذمہ قاضی کے فرائض انجام دینے کی ذمہ داری ہے یا کسی دوسرے علاقہ میں رہائش اختیار کر لے یا دیوالیہ قرار دیا جائے یا اپنا عہدہ چھوڑنا چاہتا ہو یا فرائض کی انجام دہی سے انکار کرے یا حکومت کی نگاہ میں ذمہ داریوں کے نااہل قرار پائے یا جسمانی طور پر اپنے فرائض کی انجام دہی سے معذور ہو جائے تو حکومت اسے معطل یا برخاست کر سکتی ہے۔

نائب قاضی- اس ایکٹ کے تحت جس قاضی کا تقرر کیا گیا ہے وہ اپنی مدد کے لئے ایک یا ایک سے زیادہ نائب قاضی مقرر کر سکتا ہے جو اس علاقہ میں یا علاقہ کے کسی مخصوص حصے میں جس کا وہ قاضی ہے اپنے فرائض انجام دیں گے۔ قاضی اپنے نائبوں کو معطل یا برخاست کر سکتا ہے۔

اگر ایکٹ کی دفعہ-۲ کے تحت کسی قاضی کو معطل یا برخاست کیا جائے گا تو اسی کے ساتھ نائب قاضی بھی (اگر کوئی ہو) معطل یا برخاست شدہ سمجھے جائیں گے۔

اس ایکٹ کی مندرجات سے قاضیوں کو کوئی جوڈیشیل یا انتظامی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے، نہ کسی تقریب میں ان کی موجودگی لازمی ہوگی اور نہ کسی کو بطور قاضی کام کرنے سے روکا جائے گا۔

مسلم خواتین (طلاق کی صورت میں حقوق کا تحفظ) ایکٹ ۱۹۸۶ء

تعارف

مقدمہ: محمد احمد خاں بنام شاہ بانو بیگم میں سپریم کورٹ نے فیصلہ صادر کیا کہ اگر مطلقہ عورت اپنی کفالت کر سکتی ہے تو عدت ختم ہونے پر نان ونفقہ کی ادائیگی کی شوہر کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی لیکن اگر عورت اپنے اخراجات کو برداشت نہیں کر سکتی تو اسے ضابطہ فوجداری ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت کارروائی کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

مذکورہ بالا فیصلے سے مطلقہ عورت کو نان ونفقہ دینے کی بابت مسلم شوہر کی ذمہ داریوں سے متعلق کچھ تنازعات پیدا ہو گئے۔ مذکورہ مقدمہ میں دئے گئے فیصلہ کو کالعدم کرنے کے لئے مسلم خواتین (طلاق کی صورت میں حقوق کی حفاظت) بل پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔

مقاصد ووجوہات کی بابت بیان

مقدمہ: محمد احمد خان بنام شاہ بانو بیگم ودیگر (اے آئی آر ۱۹۸۵ء، ایس سی ۹۴۵) میں سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ اگرچہ مسلم قانون کے تحت ایک مسلمان شوہر اپنی مطلقہ عورت کو صرف عدت ختم ہونے تک نان ونفقہ دینے کا پابند ہے تاہم اس میں ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت مندرجہ صورت حال پر کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ عدالت نے فیصلہ دیا کہ مسلم لا کے مذکورہ بالا اصول کو ایسے

کیسوں میں جہاں ایک مطلقہ عورت اپنی کفالت خود نہیں کرسکتی، اطلاق کرنا غلط اورانصاف کے خلاف ہوگا۔ لہٰذا عدالت اس نتیجہ پر پہونچی کہ ایسے معاملات میں جہاں ایک مطلقہ عورت اپنی کفالت اپنے آپ کرسکتی ہو، وہاں عدت ختم ہونے پر نان ونفقہ کی بابت شوہر کی ذمہ داری ختم ہوجائے گی لیکن جو مطلقہ عورت اپنی کفالت کا بوجھ نہیں اٹھاسکتی اسے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت کارروائی کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

اس فیصلے کی وجہ سے مطلقہ عورت کو نان ونفقہ دینے کی ایک مسلم شوہر کی ذمہ داریوں کی بابت تنازعات پیدا ہوگئے ہیں۔ لہٰذا اس موقع پر طلاق کی صورت میں مسلم مطلقہ عورت کے حقوق اور اس کے مفاد کے تحفظ کی بابت صراحت کی جاتی ہے۔ اس بل میں مندرجہ ذیل دیگر امور کا بندوبست ہے۔

(الف) ایک مسلم مطلقہ عورت عدت کے دوران اپنے سابق شوہر سے اپنے لئے مناسب اخراجات وصول کرنے کی حقدار ہوگی، اور اگر اس پر اپنے ان بچوں کی پرورش کی ذمہ داری بھی ہے جو طلاق سے پہلے یا طلاق کے بعد پیدا ہوئے ہوں تو ان بچوں کی تاریخ پیدائش سے دوسال کی مدت تک اسے ان بچوں کے لئے مناسب اخراجات ادا کئے جائیں گے، مہر اور ان تمام اثاثوں اور املاک پر بھی اس کا حق ہوگا جو اسے اس کے رشتہ داروں، سہیلیوں، شوہر اور شوہر کے رشتہ داروں سے ملے ہوں، اگر طلاق کے وقت اس عورت کو یہ فائدے حاصل نہیں ہوئے تو وہ مجسٹریٹ کے روبرو استغاثہ دائر کرسکتی ہے کہ اس کے سابق شوہر کو ان اخراجات، مہر اور ان اثاثوں کی ادائیگی کے لئے حکم صادر کیا جائے۔

(ب) اگر ایک مسلم مطلقہ عورت عدت کے بعد اپنی کفالت کا بوجھ خود نہیں اٹھاسکتی تو مجسٹریٹ کو اختیار ہوگا کہ وہ اس مطلقہ عورت کے رشتہ داروں کو اس کے اخراجات کی کفالت کا حکم دے، یہ رشتہ دار اس تناسب سے اس کے خرچہ کا بار برداشت کریں گے جس تناسب سے اس عورت کی وفات پر مسلم قانون کے

تحت اس کی جائداد کے وارث ہوں گے، اگر ان رشتہ داروں میں سے کوئی شخص (عورت/مرد) اپنے افلاس کے سبب خرچہ برداشت کرنے سے قاصر ہو تو مجسٹریٹ دیگر رشتہ داروں کو جو صاحب حیثیت ہوں حکم دے گا کہ وہ ان غریب رشتہ داروں کے حصہ کا خرچہ بھی ادا کریں، لیکن اگر کسی مطلقہ عورت کے رشتہ دار نہ ہوں یا رشتہ دار ایسے صاحب حیثیت نہ ہوں کہ اس عورت کا خرچہ برداشت کرسکیں یا اپنے نادار رشتہ داروں کی طرف سے ادا کئے جانے والے حصہ کا بارِ ادائیگی برداشت کرنے کے قابل نہ ہوں تو مجسٹریٹ ریاستی وقف بورڈ کو حکم جاری کرے گا کہ اس مطلقہ عورت کو خرچہ کی ادائیگی کی بابت جو حکم جاری کیا گیا ہے اس کے مطابق خرچہ دے یا نادار رشتہ داروں پر عائد ہونے والے خرچہ کی رقم اس عورت کو ادا کرے۔

اس بل سے مندرجہ بالا مقاصد کا حصول مطلوب ہے

۱۹۸۶ء کا ایکٹ (۲۵)

مسلم خواتین (طلاق کی صورت میں حقوق کا تحفظ) بل پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پاس ہوا اور ۱۹/مئی ۱۹۸۶ء کو اسے صدر جمہوریہ کی منظور حاصل ہوئی اور اسے صحیفہ قانون میں بعنوان مسلم خواتین (طلاق کی صورت میں حقوق کی حفاظت) ایکٹ ۱۹۸۶ء (۱۹۸۶ کا ۲۵واں) کے طور پر شامل کیا گیا۔

مسلم خواتین (طلاق ہونے پر حقوق کا تحفظ) ایکٹ ۱۹۸۶ء

(۱۹۸۶ء کا ۲۵واں ایکٹ)

۱۹رمئی ۱۹۸۶ء

یہ ایکٹ ان مسلم خواتین کے حقوق کے تحفظ سے متعلق ہے جنہیں طلاق دے دی گئی ہے یا جنہوں نے اپنے شوہروں سے طلاق لے لی ہے، نیز ان امور سے متعلق جو اس سے متعلق ہوں یا ضمنی طور پر ابھریں یہ ایکٹ جمہوریہ ہند کے سینتیسویں سال میں پارلیمنٹ حسب ذیل طور پر مرتب کرتی ہے۔

۱۔مختصر عنوان اور دائرہ عمل

(۱) اس ایکٹ کو مسلم خواتین (طلاق ہو جانے پر حقوق کی حفاظت) ایکٹ ۱۹۸۶ء کہا جائے گا۔

(۲) صوبہ جموں وکشمیر کو چھوڑ کر پورے ہندوستان میں نافذ العمل ہوگا۔

۲۔تعریف

اس ایکٹ میں جب تک کہ عبارت بصورت دیگر مطلوب نہ ہو۔

(الف) مطلقہ عورت سے مراد وہ مسلمان عورت ہے جس کی شادی مسلم قانون کے تحت عمل میں آئی تھی اور اب اسے طلاق دے دی گئی یا اس نے مسلم قانون کے تحت اپنے شوہر سے طلاق حاصل کر لی ہو۔

(ب) عدت کی مدت سے مراد ہے کہ مطلقہ عورت

(ب ''الف) اگر اسے ماہواری آتی ہو تو طلاق دئے جانے کی تاریخ سے تین ماہواری کی مدت۔

(ب ''ب'') اگر ماہواری نہیں آتی ہے تو تین قمری مہینے جو طلاق دینے کی تاریخ سے شروع ہوں۔

(ب ''ج'') اگر طلاق کے وقت وہ حاملہ ہے تو طلاق اور وضع حمل یا حمل ساقط ہونے (جو بھی پہلے واقع ہو) کی درمیانی مدت۔

(ج) مجسٹریٹ سے مراد وہ مجسٹریٹ درجہ اول ہے جسے تعزیرات ہند ۱۹۷۳ء کے تحت اس علاقے میں جہاں وہ مطلقہ عورت رہتی ہے عدالتی امور کے اختیارات حاصل ہوں۔

(د) مقررہ سے مراد اس ایکٹ کے تحت مقرر کردہ قواعد

۳۔ مطلقہ عورت کا مہر اور دیگر جائدادیں (اثاثہ جات) جو بوقت طلاق اسے دئے جائیں گے اس وقت جو بھی قانون نافذ العمل ہو اس کی مندرجات کے باوجود ایک مطلقہ عورت کو حق حاصل ہوگا کہ:

(الف) عدت کے دوران اس کے سابق شوہر کی طرف سے اس عورت کو معقول نان ونفقہ خرچہ صرفہ کا بندوبست کرنا ہوگا۔

(ب) ان حالات میں جہاں اس عورت کو ان بچوں کی پرورش بھی کرنی ہے جو طلاق سے قبل یا بعد کو پیدا ہوئے ہوں تو سابق شوہر کو ان بچوں کی تاریخ ولادت سے دو سال کی مدت تک ان کی کفالت کے لئے بھی معقول اور مناسب بندوبست کرنا ہوگا۔

(ج) مہر کی رقم یا اس کے مساوی جو شادی کے وقت یا اس کے بعد باہمی رضامندی سے اسلامی قانون کے تحت ادا کرنا طے کیا گیا ہو۔

(د) وہ تمام اثاثہ جات جو شادی سے قبل شادی کے موقع پر یا شادی کے بعد اس عورت کو اس کے رشتہ داروں، سہیلیوں، شوہر یا شوہر کے کسی رشتہ دار یا

دوست نے دئے ہوں۔

۲- اگر طلاق دینے کے بعد شوہر اسے معقول خرچہ صرفہ نان ونفقہ نہیں دیتا یا مہر اور وہ املاک اسے واپس نہیں کرتا جن کا اوپر (۱-د) میں ذکر کیا گیا ہے تو وہ عورت ان کی ادائیگی کے لئے مجسٹریٹ کے روبرو استغاثہ دائر کرسکتی ہے۔

۳- اگر مذکورہ ذیلی دفعہ (۲) کے تحت استغاثہ کی درخواست پیش کی گئی تو مجسٹریٹ اگر مطمئن ہے کہ:

(الف) مناسب وسائل ہوتے ہوئے بھی شوہر نے عدت کے دوران اس عورت کے لئے معقول خرچہ صرفہ، نان ونفقہ اور اس کے بچوں کی کفالت کا کوئی انتظام نہیں کیا اور اس کی ذمہ داری سے غفلت کی۔

(ب) اس کا مہر ادا نہیں کیا گیا ہے یا وہ املاک واثاثہ جات جن کا اوپر ذیلی دفعہ (۱) کی کلاز (د) میں مذکور ہے اس کے حوالے نہیں کئے گئے ہیں تو استغاثہ دائر کئے جانے کی تاریخ سے ایک ماہ کے اندر سابق شوہر کو حکم جاری کرے گا کہ وہ مطلقہ عورت کو مناسب اور معقول نان ونفقہ خرچہ صرفہ ادا کرے جو مناسب اور اس معیار زندگی کے مطابق ہو جس کی وہ عورت شادی کے دوران عادی تھی، نیز شوہر کے وسائل کے مطابق بھی ہو، نیز مہر کی ادائیگی اور اوپر ذیلی دفعہ (۱) کی کلاز (د) کے تحت مذکور املاک واثاثہ جات کی ادائیگی کی جائے۔

اس شرط کے ساتھ کہ اگر مجسٹریٹ مذکورہ مدت کے دوران استغاثہ کی درخواست پر کارروائی کو ناقابل عمل پائے تو وہ تحریری طور پر اسباب کی وضاحت کرکے اس مدت کے گذرجانے کے بعد اس درخواست کے معاملہ کو ختم کرسکتا ہے۔

۴- اگر کوئی شخص جس کے خلاف ذیلی دفعہ (۳) کے تحت حکم جاری کیا گیا ہے، بغیر کسی معقول وجہ کے تعمیل حکم نہیں کرتا تو مجسٹریٹ تعزیرات ہند ۱۹۷۳ء میں جرمانے وغیرہ عائد کرنے کی مندرجات کے تحت مہر کی رقم یا نان ونفقہ کی رقم

کی ادائیگی کے لئے وارنٹ جاری کرسکتا ہے اور اگر شخص مذکور اجرائے وارنٹ کے بعد کلی یا جزوی طور پر رقم ادا کرنے سے قاصر رہے تو اسے ایک سال تک قید کی سزا دے سکتا ہے یا اس مدت سے قبل تک کے لئے جبکہ رقم کی ادائیگی کی جائے بشرطیکہ اس شخص کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جائے، یہ سزا مذکورہ تعزیرات کی دفعات کے تحت سنائی جائے گی۔

۴- خرچہ کی ادائیگی کے لئے حکم جاری کرنا

(۱) اس ایکٹ میں مذکورہ بالا دفعات یا کسی دیگر قانون کی جو نافذ العمل ہو، کی مندرجات کے باوجود اگر مجسٹریٹ مطمئن ہے کہ مطلقہ عورت عدت گذارنے کے بعد اپنا خرچہ خود برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے تو وہ ان رشتہ داروں کو جو اس عورت کی وفات پر اس کے ترکہ کے وارث ہوں گے یہ حکم جاری کرسکتا ہے کہ وہ عورت مذکور کو اس کی ضروریات اور اسی معیار زندگی کے مطابق جس کا تعین اس حکم میں کیا جائے، خرچہ ادا کریں۔ یہ خرچہ وہ رشتہ دار اس تناسب سے ادا کریں گے جس تناسب سے وہ اس عورت کے ترکہ میں حصہ دار ہوں گے۔

اس شرط کے ساتھ کہ اگر اس مطلقہ عورت کے بچے ہوں تو مجسٹریٹ صرف ان بچوں کو حکم دے گا کہ وہ اس عورت کا خرچہ اٹھائیں اور اگر کوئی بچہ یا بچے یہ بار کفالت برداشت کرنے سے قاصر ہیں تو مجسٹریٹ اس عورت کے والدین کو حکم دے گا کہ وہ اس کے خرچہ کے کفیل ہوں۔

اس مزید شرط کے ساتھ کہ اگر والدین میں سے کوئی ایک اپنی مالی بے بضاعتی کے سبب خرچہ کا اپنا حصہ دینے سے معذور ہے جس کا مجسٹریٹ نے حکم صادر کیا ہے تو اس امر کا ثبوت پیش کئے جانے پر وہ اس عورت کے ان دیگر رشتہ داروں کو جو مجسٹریٹ کے نزدیک صاحب حیثیت ہوں اس تناسب سے خرچہ ادا کرنے کا حکم جاری کرسکتا ہے جو وہ مناسب خیال کرے۔

(۲) اگر کوئی مطلقہ عورت اپنا خرچہ خود برداشت نہیں کرسکتی اور اس کے وہ رشتہ دار بھی نہیں ہیں جن کا حوالہ ذیلی دفعہ (۱) کے تحت کیا گیا ہے یا وہ رشتہ دار یا ان میں سے کوئی خرچہ کی وہ رقم ادا کرنے کی حیثیت نہیں رکھتے جس کا مجسٹریٹ نے حکم جاری کیا ہے یا دیگر رشتہ دار خرچہ میں اپنا حصہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا جو مجسٹریٹ نے ذیلی دفعہ (۱) کے جملہ شرطیہ کے تحت مقرر کیا ہے تو مجسٹریٹ ریاستی وقف بورڈ کو جو وقف ایکٹ ۱۹۵۴ء کی دفعہ ۹ / کے تحت قائم کیا گیا ہے یا فی الوقت کسی اور قانون کے تحت قائم ہو، اور اس علاقہ میں کام کرتا ہو جہاں وہ مطلقہ عورت رہتی ہے، یہ حکم جاری کرسکتا ہے کہ وہ اس عورت کا خرچہ ادا کرے جس کا تعین مجسٹریٹ مذکور نے ذیلی دفعہ کے تحت کیا ہے یا اس رشتہ دار کے حصہ کی رقم ادا کرے جو اس کی ادائیگی سے قاصر ہے۔ یہ رقم اس طریقہ سے ادا کی جائے گی جو مجسٹریٹ متعین کرے۔

۵- ۱۹۷۴ء کی دفعات ۱۲۵ تا ۱۲۸ کے تحت کارروائی کا اختیار

اگر دفعہ (۳) کی ذیلی دفعہ (۲) کے تحت دی گئی درخواست کی پہلی پیشی پر مطلقہ عورت اور اس کا سابق شوہر مشترکہ طور پر یا علیحدہ علیحدہ حلف نامے یا کسی دیگر تحریری بیان میں جو مقرر کردہ فارم پر داخل کیا گیا ہو یہ اعلان کریں کہ وہ تعزیرات ہند ۱۹۷۳ء (۱۹۷۴ء کا دوسرا ایکٹ) کی دفعہ ۱۲۵ تا ۱۲۸ کے تحت کارروائی چاہتے ہیں وہ یہ بیان عدالت میں پیشی کے دوران داخل کریں تو مجسٹریٹ اسی کے مطابق درخواست پر کارروائی کرے گا۔

تشریح: اس دفعہ کے تحت درخوست کی سماعت کی پہلی تاریخ سے مراد وہ تاریخ ہے جو مدعا علیہ کو حاضری کے لئے جاری کردہ سمن میں درج کی گئی ہو۔

۶-قواعد بنانے کا اختیار

اس ایکٹ کے مقاصد کی بجا آوری کے لئے مرکزی حکومت سرکاری گزٹ میں نوٹیفکیشن جاری کر کے قواعد مرتب کرسکتی ہے خصوصی طور پر اور اوپر مذکور اختیارات پر اثر انداز ہوئے بغیر، ان قواعد میں مندرجہ ذیل اور کا بندوبست ہوگا۔

(الف) حلف نامہ کا فارم یا کسی دوسرے تحریری بیان کا فارم جو دفعہ (۵) کے تحت داخل کیا جائے۔

(ب) اس ایکٹ کے تحت دائر کردہ درخواست پر کارروائی کا طریقہ جو مجسٹریٹ ان درخواستوں پر غور کرتے ہوئے بروئے عمل لائے بشمول متعلقہ فریقین کو نوٹس جاری کرنا، درخواست کی سماعت کے لئے تاریخ مقرر کرنا اور دیگر متعلقہ امور۔

(ج) کوئی دیگر معاملہ جس کو مقرر کیا جانا مطلوب ہو، یا مقرر کیا جائے، اس ایکٹ کے تحت مرتب کردہ ہر قاعدے کو جلد سے جلد پارلیمنٹ کے ہر ایک ایوان کے روبرو پیش کیا جائے گا جبکہ اس کا اجلاس مجموعی طور پر تیس دن کے لئے ہو رہا ہو خواہ یہ ایک سیشن پر مشتمل ہو یا دو، یا یکے بعد دیگرے ہونے والے سیشن ہوں اور اگر اوپر مذکور مسلسل سیشن کے فوراً بعد ختم ہونے والے سیشن سے قبل اگر دونوں ایوان ان قواعد میں کسی ترمیم پر متفق ہوں یا یہ فیصلہ کریں کہ قواعد نہ بنائے جائیں تو ان ضوابط کا نفاذ اس ترمیم شدہ شکل میں ہوگا یا پھر نہیں ہوگا جیسی بھی صورت حال ہو، تاہم ایسی کسی ترمیم تبدیلی کا اس کارروائی پر اثر نہیں پڑے گا جو اس سے قبل اس ضابطہ کے تحت عمل میں آئی۔

۷-عبوری بندوبست

تعزیرات ہند ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۱۲۵ یا دفعہ ۱۲۷ کے تحت کسی مطلقہ عورت کی طرف سے دائر کردہ ہر درخواست جو اس ایکٹ کے نافذ العمل ہونے کی تاریخ کو

کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں زیر سماعت ہوتو اس ایکٹ کی مندرجات کے باوجوداوراس ایکٹ کی دفعہ (۵) کی مندرجات کی شرائط کے تحت مجسٹریٹ اس درخواست کا فیصلہ اس ایکٹ کے مطابق کرے گا۔

کچی میمن ایکٹ ۱۹۳۸ء

(۱۹۳۸ء کا دسواں ایکٹ)

اس ایکٹ کے ذریعہ یہ طے کیا گیا ہے کہ ساری کچی میمن برادری پر وراثت اور جانشینی کے معاملات میں محمڈن لا کا اطلاق ہوگا۔

کیونکہ یہ مناسب ہے کہ تمام میمن برادری کو وراثت اور جانشینی کے معاملات میں محمڈن لا کے تحت لایا جائے، لہذا یہ ایکٹ حسب ذیل طور پر پاس کیا جاتا ہے۔

مختصر عنوان اور آغاز

اس ایکٹ کو کچی میمن ایکٹ ۱۹۳۸ء کہا جائے گا۔

۱-اس کا نفاذ یکم نومبر ۱۹۳۸ء سے عمل میں آئے گا۔

۲- کچی میمن برادری پر کچھ معاملات میں دفعہ (۳) کی شرائط کے تحت محمڈن لا کا اطلاق ہوگا۔ وراثت اور جانشینی کے معاملات میں کچی برادری پر محمڈن لا کا اطلاق ہوگا۔

۳-استثناء-اس ایکٹ کے نافذ العمل ہونے سے پہلے واجب ہونے والے کسی حق، ذمہ داری، یا مقدمہ کی کارروائی یا اس کے حل پر اس ایکٹ کا اثر نہیں پڑے گا اور وہ کارروائی اور اس کے تصفیہ کے امور اسی طرح جاری رہیں گے گویا یہ بل پاس ہی نہیں ہوا ہے۔

کچی میمن ایکٹ ۱۹۳۸ء

تعارف

کچی میمن برادری پر کچی میمن ایکٹ ۱۹۲۰ء کا نفاذ ہوتا تھا، لیکن اس برادری کا ایک چھوٹا طبقہ مسلسل مطالبہ کر رہا تھا کہ ان پر روایتی ضابطوں کا اطلاق ہونا چاہئے۔ یکسانیت لانے کی غرض سے یہ مناسب تھا کہ پوری کچی میمن برادری کو محمڈن لا کے تحت لایا جائے۔ لہذا اسمبلی میں کچی میمن بل پیش کیا گیا۔

اسباب و مقاصد کا بیان

کچی میمن ایکٹ ۱۹۲۰ء کو پاس ہوئے خاصی مدت گذر چکی ہے اور برادری کے کثیر افراد نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن ایک مختصر سی تعداد ایسے افراد کی بھی ہے جو اب بھی یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ روایتی قوانین کا نفاذ کیا جائے اس سے معاملات کے پیچیدہ ہونے کا اندیشہ ہے، لہذا یکسانیت پیدا کرنے کی غرض سے یہ بے حد مناسب ہوگا کہ پوری کچی میمن برادری کو محمڈن لا کے تحت لایا جائے گا۔ کچی میمن برادری کے لوگ اچھے مسلمان ہوتے ہیں اور ان کی عام خواہش یہ ہے کہ انہیں محمڈن لا کے تحت لایا جائے۔ اگر یہ بل پاس ہوگیا تو برطانوی ہندوستان میں کچی میمن برادری کے وراثت اور جانشینی سے متعلق امور کے حل میں یکسانیت پیدا ہوجائے گی، اس سے برطانوی ہندوستان کی عدالتوں میں مقدمات کا تصفیہ کرنے میں بھی بہت مدد ملے گی، کیونکہ تب وہ ایک منظور شدہ قانون کے تحت طے کئے جایا کریں گے جبکہ اس وقت ایسے مقدمات کا صحیح فیصلہ

کرنے میں روایتی رسوم و رواج اور دستور کے پیچیدہ راستوں سے گذرنا پڑتا تھا۔ لہذا یہ مناسب ہے کہ اس بل کو پاس کیا جائے۔

۱۹۳۸ء کا دسواں ایکٹ

کچی میمن بل قانون سازیہ میں پاس ہوا اور ۸ر اپریل ۱۹۳۸ء کو اسے منظوری حاصل ہوئی اور قانون کی کتاب میں اسے دی کچی میمن ایکٹ ۱۹۳۸ء (۱۹۳۸ء کا دسواں ایکٹ) (The Cutchi Memons Act, 1938 (10 of 1938)) کے عنوان سے درج کیا گیا۔